ہر اتوار کو روزنامہ اسلام کے ساتھ شائع ہوتا ہے

روزنامہ اسلام

بچوں کا اسلام

588 اتوار 22 ذیقعدہ 1434ھ مطابق 29 ستمبر 2013ء

پرانی ڈائری

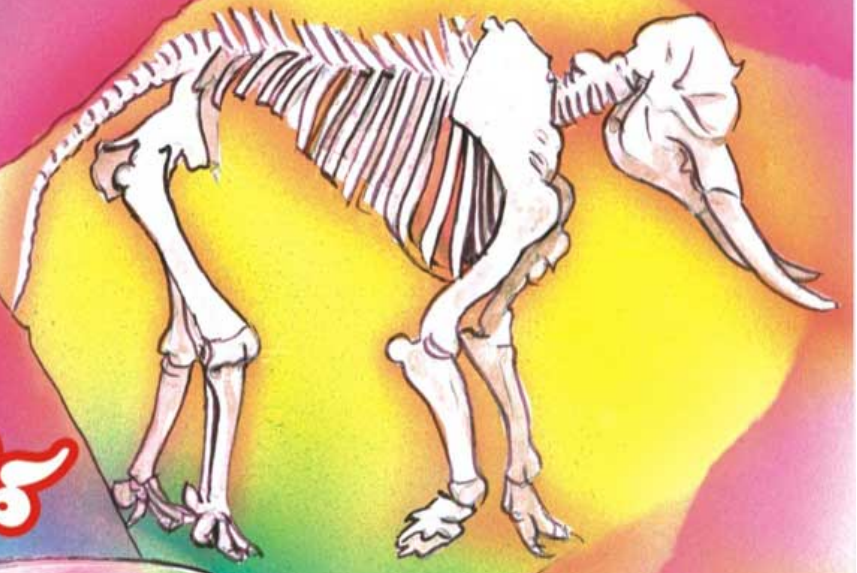

کاش!

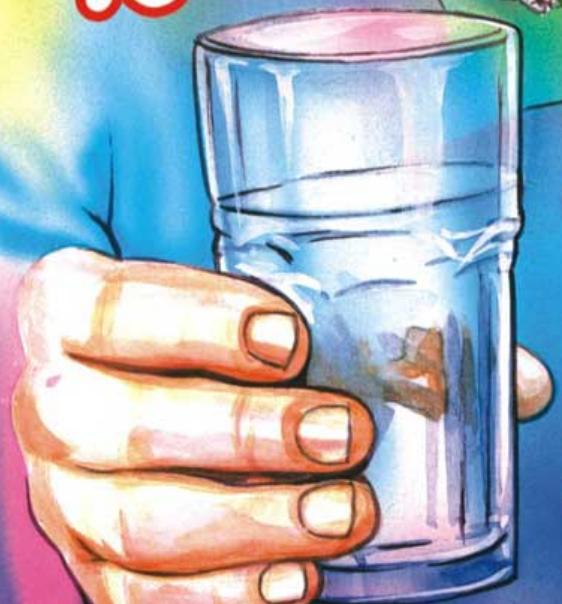

وہ شخص

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بے نیاز ہے

’’جو شخص اللہ سے جاملنے کی امید رکھتا ہو، اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی میعاد ضرور آ کر رہے گی اور وہی ہے جو ہر بات سنتا، ہر چیز جانتا ہے O اور جو شخص بھی ہمارے راستے میں محنت اٹھاتا ہے، وہ اپنے ہی فائدے کے لیے محنت اٹھاتا ہے۔ یقیناً اللہ تمام دنیا جہاں کے لوگوں سے بے نیاز ہے۔

(سورہ عنکبوت:6،5)

انعامات

حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’شہید کے لیے چھ خصلتیں ہیں، پہلی دفعہ ہی اسے بخش دیا جاتا ہے، اسے جنت میں اس کی جگہ دکھادی جاتی ہے، عذابِ قبر سے اسے محفوظ رکھا جاتا ہے، بڑی گھبراہٹ سے وہ امن میں رہتا ہے، اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا جس کا ایک یاقوت دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، سے بہتر ہوگا۔ بہتر حوروں سے اس کا نکاح کیا جائے گا۔ اپنے عزیزوں میں ستر آدمیوں کے لیے اس کی سفارش قبول کی جائے گی۔‘‘ (ترمذی۔ ابن ماجہ)

دو باتیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

گذشتہ شمارے کی دو باتیں میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ الحمدللہ بچوں کا اسلام اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے بہت مالا مال ہے، پہلی مال داری کا میں نے ذکر کیا تھا کہ قارئین کی مال داری ہے اور دوسری مال داری یہ کہ بچوں کا اسلام کو شروع کرنے والا ادارہ ماشاء اللہ تمام کا تمام ہی علماء کا ادارہ ہے، یعنی یہ حضرات پہلے ہی دین سے مالا مال ہیں تو بچوں کا اسلام کیوں اس دولت سے مالا مال نہیں ہوگا۔ بس یہاں تک لکھ پایا تھا کہ دو باتیں کے لیے مخصوص کی گئی جگہ ختم ہوگئی۔ اس لیے ان دو باتیں کو ادھورا چھوڑنا پڑا اور اسی لیے اس وقت وہیں سے سلسلہ جوڑ رہا ہوں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے لیجیے گا کہ میں جوڑ توڑ کا ماہر ہوں۔ ویسے لوگ ہوتے ہیں جوڑ توڑ کے ماہر، بلکہ بہت پرانے ماہر بھی ہوتے ہیں، لیکن ہمیں ان سے کیا لینا۔ میں تو بات کر رہا تھا جوڑنے کی، نہ کہ توڑنے کی۔

ہاں تو اب بات ہو جائے اگلی مال داری کی ... اللہ تعالیٰ نے بچوں کا اسلام کو بہت اچھے اچھے اور بہت سمجھ دار اور بہت پڑھے لکھے لوگ عطا فرمائے ہیں ... بچوں کا اسلام اگرچہ نام کے اعتبار سے بچوں کا رسالہ ہے ... لیکن اسے ہر عمر کے لوگ پڑھتے ہیں ... اور اسی اعتبار سے بچوں کا اسلام کو لکھنے والے بھی ملے ہیں یعنی اس میں، ہر عمر اور ہر قابلیت کے لوگ لکھتے ہیں اور اپنی چیزیں شائع ہونے پر بالکل بچوں کی طرح پھولے نہیں سماتے ... یعنی لکھنے والوں میں ڈی آئی جی اور پروفیسر صاحبان جیسے لوگ تک موجود ہیں اور ایم اے ایم ایڈ اور انجینئرز جیسے لوگ ملے ہیں ... تو ہوا نا بچوں کا اسلام مالا مال ... باقی لکھنے والے بھی اگرچہ اس طرح کے عہدے دار تو نہیں، اتنے زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں ... لیکن لکھنے کے معاملے میں ان سے کم بھی نہیں ... مطلب یہ کہ لکھنے کا تعلق اعلیٰ طبقے سے نہیں، اعلیٰ ڈگریوں سے نہیں ... لکھنے کا تعلق تو انسان کے اپنے اندر سے ہے ... اندر کا انسان جب لکھنے کے لیے سر ابھارتا ہے تو اپنی تعلیمی قابلیت کو نہیں دیکھتا ...

اس لحاظ سے بھی بہترین لکھنے والے اللہ تعالیٰ نے بچوں کا اسلام کو عطا فرمائے ہیں اور یہ کوئی کم مال داری نہیں ...

ایک اور مال داری یہ کہ اس کے لیے کام کرنے والے بہت پر خلوص ہیں ... دن دیکھتے ہیں نہ رات ... بس کام کیے چلے جا رہے ہیں ... انتھک کہیں کے ... بہر حال ان کے خلوص کی مال داری بھی بچوں کا اسلام کو حاصل ہے اور یہ بھی کوئی کم مال داری نہیں ...

بچوں کا اسلام کی مال داری میں ایک اور طبقے کا بھی حصہ ہے ... اگرچہ آپ قارئین اس طبقے کو پسند نہیں کرتے، لیکن بچوں کا اسلام کی مال داری میں بہر حال ان کا بھی حصہ ہے ... اور وہ ہیں ... کاروباری حضرات ... جو اپنے اشتہارات کے ذریعے اسے مالا مال دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے ... کبھی کبھار ان سے بھول چوک ضرور ہو جاتی ہے ...

ایک آخری مال داری کا ذکر بھی کرتا ہوں ... بچوں کا اسلام سے متعلق تمام حضرات ... قارئین! لکھنے والے، اس کے لیے کام کرنے والے، اسے فروخت کرنے والے ... سبھی ایک خان دان کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ... یہ سب ایک دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ اور ایک دوسرے کے سکھ کو اپنا سکھ سمجھتے ہیں اور دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں ... اس طرح بھائی چارے کے ایک ماحول سے بچوں کا اسلام مالا مال ہے ... اور میں سمجھتا ہوں ... یہ مال داری سب سے بڑی مال داری ہے ... اللہ ہمارے بچوں کا اسلام کو اور زیادہ مالا مال کرے آمین ...

ہو سکتا ہے ... بچوں کا اسلام کو کچھ اور بھی مال داریاں حاصل ہوں ... جن کی طرف میرا دھیان نہ گیا ہو ... ان مال داریوں کی طرف آپ اپنے خطوط کے ذریعے توجہ دلا سکتے ہیں ... ہم ان کا ذکر دو باتیں میں یا خطوط میں ضرور کریں گے اور خوشی محسوس کریں گے ...

والسلام

سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک: 600 روپے، بیرونِ ملک: 3700 روپے

خط کتابت کا پتہ: ”بچوں کا اسلام“ دفتر روزنامہ اسلام ناظم آباد 4 کراچی فون: 021 36609983

bkislam4u@gmail.com :ای میل www.dailyislam.pk :بچوں کا اسلام انٹرنیٹ پر بھی

اسکول کے دن

ہم بزمِ اطفالِ شریراں کے ایک قابلِ ذکر کارکن تھے۔ جس سکول میں ہمیں داخل کروایا جاتا، وہاں اتنی تھوک کے حساب سے ہماری شکایات موصول ہوتیں کہ وہ ہمیں کان سے پکڑ کر بصد ادب واحترام سکول سے خارج کر کے گھر بھیج دیتے۔ روشنائی پینا ہمارا بہترین مشغلہ تھا۔ پوری ڈبی منہ کو لگاتے اور خالی کر کے دوبارہ بستے میں ڈال لیتے۔ اکثر طالب علموں کو اپنی روشنائی والی ڈبیاں خالی ملتیں۔ کلاس کے خاموش ماحول میں اچانک ہمارے قریب بیٹھا بچہ رونا شروع کر دیتا، کیونکہ ہم اتنی ہوشیاری سے اسے چونڈی کاٹتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی اور ہم اپنا منہ ایسے بنا لیتے جیسے ہمیں کسی چیز کا علم ہی نہ ہو۔ جس دن ہماری کلاس کا کوئی ٹیسٹ ہوتا، ہماری غیر حاضری پکی ہوتی۔ ہم گھر سے سکول کے لیے روانہ ہوتے اور پڑوس میں اماں نورن کے گھر بستے رکھتے اور اُن سے کہتے کہ ہم ابھی آئے۔ سارا دن ادھر اُدھر گھوم پھر کر چھٹی کے وقت واپس آتے۔ اماں نورن کے گھر سے اپنے بستے اُٹھاتے اور گھر آجاتے۔

ایک دفعہ ٹیسٹ والے دن ہم نے بیماری کا بہانہ بنایا۔ بعد میں ایک لڑکے نے ہمیں بتایا کہ آج ٹیسٹ نہیں ہے۔ ہم فوراً سکول کے لیے تیار ہو گئے۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ کسی نے ہمیں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ آج ٹیسٹ ہے اور وہ بھی سر شاہد کا، جو ہمیں ریاضی پڑھایا کرتے تھے اور یہ کم بخت ریاضی کبھی ہمارے سر کے اُوپر سے گزر جاتی اور کبھی پاؤں کے نیچے سے۔ ہم چند لڑکے فوراً وہاں سے کھسک گئے۔ بستے اماں نورن کے گھر رکھے اور خود وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ ادھر والدِ محترم کو خیال آیا: برخوردار کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، پھر بھی وہ سکول چلا گیا۔ ماشاء اللہ کتنا ذمہ دار اور شوق والا بچہ ہے۔ چلو سکول جا کر اس کی خبر ہی لے لیں۔'' والدہ محترمہ بھی بول پڑیں: ''واپسی پر بچے کو ساتھ لے آیئے گا۔ استاد صاحب سے آدھی چھٹی لے لیں۔'' والد صاحب سکول پہنچے تو ہم کہیں بھی نظر نہ آئے۔ سر شاہد صاحب نے انھیں پاس بٹھا کر اگلی پچھلی ساری باتیں بتا ڈالیں۔

''اس وقت ہوں گے کہاں کم بخت!'' والد صاحب نے غصے سے مٹھیاں بھینچیں۔

''اماں نورن کے گھر۔ اماں نورن کے گھر۔'' ہر طرف سے آوازیں آئیں۔

ہماری شرارتوں سے تنگ آئے سب بچوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ والد صاحب سکول سے سیدھے اماں نورن کے گھر پہنچے۔ اماں نورن نے بتایا: ''بچے بستے رکھ گئے ہیں۔ بس آتے ہی ہوں گے۔''

''اچھا! بستے بھی یہاں رکھ گئے ہیں۔ آنے دو! آنے دو ذرا آج ان کو۔''

حافظ عبدالجبار سیال۔ لاہور

کچھ ہی دیر میں ہم خراماں خراماں چلتے اماں نورن کے گھر پہنچے۔ ہمارے پاؤں کیچڑ سے اٹے ہوئے تھے اور کپڑے پانی میں شرابور تھے، کیونکہ آج ٹیسٹ سے جان چھڑانے کے لیے قریبی نہر میں نہانے کا پروگرام بن گیا تھا۔ ادھر ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ آج ہمارے ساتھ کیا انہونی ہونے والی ہے۔ صحن میں داخل ہوتے ہی ہماری نگاہیں والد صاحب کی سرخ سرخ آنکھوں سے ٹکرائیں۔ ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ اپنی آنکھوں کو زور سے رگڑا۔ کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنے حواس بحال کرتے۔ والد صاحب کا ہاتھ ہمارے سر کے ان بالوں پر پڑا جو ابھی ابھی نہر کے پانی سے بھیگے ہوئے چاندی کا منظر پیش کر رہے تھے۔

قصہ مختصر اگر اماں نورن مداخلت نہ کرتیں تو ہمارا شمار مرحومین کی فہرست میں ہوتا۔

فوراً سے پہلے ہمیں سکول سے ہٹا لیا گیا۔ اب ہمیں ایک نئے سکول میں داخل کرایا گیا مگر شومئی قسمت کہ وہاں صرف ایک ہی دن جانا نصیب ہوا۔ وجہ یہ بنی کہ جب ہم نئے سکول میں پہنچے تو ایک ننھا منا بچہ بے تحاشا رو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہمارا بھی رونے کو بہت دل چاہا۔ میرے دوست عبدالوہاب نے مجھے دیکھا اور میں نے اسے۔ بچے کو اپنا گھر یاد آرہا تھا اور ہمیں اماں نورن کا گھر۔ اسے اپنے کھلونے یاد آرہے تھے اور ہمیں نہر میں نہانا، ڈبکیاں لگانا اور تیرنا۔

استادِ محترم نے ہم نئے آنے والے طلباء کا جائزہ لیا۔ ہم تو بالکل کورے نکلے۔ استاد صاحب نے اس بچے سے قاعدہ لے کر ہمارے سامنے رکھا اور ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟'' ہم نے ایک اُچٹتی نگاہ اس پر ڈالی اور بولے: ''گدھا ہے جی!''

حالانکہ وہ اچھی بھلی ب، بکری تھی۔ استاد صاحب کو ہماری اس بے توجہی پر سخت غصہ آیا اور انھوں نے گرج دار آواز سے کہا: ''نالائقو! یہ آپ ہو آپ! غور سے دیکھ کر بتاؤ!'' استاد صاحب کی گرج دار آواز سے ہم بوکھلا گئے۔ ہڑبڑی میں ہم نے انھی کے الفاظ دہرائے:

''یہ آپ ہو آپ۔''

استاد صاحب نے اپنے چاروں طرف دیکھا اور پھر ہمیں ایک زور دار چپت رسید کی۔ ہم قلابازیاں کھاتے دور جا گرے۔ یہ ہمارے لیے کوئی نئی صورتِ حال نہیں تھی۔ صرف ہمارے کانوں میں خارش ہوئی۔ سو ہم نے کر لی۔ اُٹھتے اُٹھتے بھی ہم نے ایک شرارت یہ کی کہ بچے کو آنکھیں نکال نکال کر ڈرا دیا۔ وہ پہلے ہی رو رہا تھا۔ اب اس کی آواز اور بھی اونچی ہو گئی۔ استاد ہمیں چھوڑ کر بچے کی طرف متوجہ ہوا: ''یہ کیا ہے؟'' مگر بچہ خاموش۔ ''یہ ب۔ بکری ہے۔ بکری۔ الو کہیں کا۔'' استاد صاحب غصے میں تھے۔ ''ہاں تو بتاؤ، کیا ہے؟'' بچے نے بھی بوکھلاہٹ میں جواب دیا:

''یہ الو ہے الو کہیں کا۔'' اس پر نہ چاہتے ہوئے بھی ہماری کھیں کھیں نکل گئی اور پھر ہمیں فارغ کر دیا گیا۔

والد صاحب نے ہمیں تعلیم دلوانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اب انھوں نے ہمیں ایسے سکول میں داخل کروایا جہاں سخت پابندی اور نگرانی تھی۔ اب تو والد صاحب بھی ہمارے معاملے میں چوکس ہو گئے تھے۔ چھٹی کا تو یہاں تصور ہی نہیں تھا۔ سو مرتے کیا نہ کرتے، پھر ہم دل لگا کر پڑھنے لگے۔ جی ہاں اور کیا۔

...کی مانند

حوصلہ ہو حدید کی مانند
مت جیو ناامید کی مانند
بچّے بن جاؤ تم بھی سیف اللہ
خالد ابنِ ولید کی مانند
عشق و مستی مثالِ رومی ہو
زُہد بابا فرید کی مانند
ہو عبادت بھی اور شجاعت بھی
زیدؓ و سعدؓ و سعیدؓ کی مانند
نفس و شیطان کا مزاج بھی ہے
نارِ "ھل من مزید" کی مانند
رَو میں حالات کی نہ بہہ جاؤ
شخصیاتِ جدید کی مانند
کاش دنیا میں اب نہ پیدا ہو
قادیانی پلید کی مانند

اثر جونپوری

78

عبداللہ فارانی

واقعات صحابہ کے

قدم بہ قدم

ایک آدمی حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ بھی وہاں موجود تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ اس شخص کو جواب نہیں دے رہے تھے اور آپ ﷺ کو ان کا جواب نہ دینا پسند آرہا تھا اور آپ مسکرا رہے تھے۔ جب وہ شخص بہت زیادہ برا بھلا کہنے لگا تو حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے بھی اس کی کسی بات کا جواب دے دیا۔ اس پر حضور ﷺ ناراض ہو کر وہاں سے چل دیے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے یہ دیکھا تو آپ بھی حضور ﷺ کے پیچھے چل دیے۔ پھر جا کر آپ سے عرض کرنے لگے:

"اے اللہ کے رسول! جب وہ مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا تو آپ بیٹھے رہے، لیکن جب میں نے اس کی کسی بات کا جواب دے دیا تو آپ کو غصہ آگیا اور وہاں سے اٹھ کر چل پڑے۔"

حضور نبی کریم ﷺ نے ان کی بات سن کر فرمایا:

"پہلے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا، وہ تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا۔ جب تم نے اس کی بات کا جواب دیا تو شیطان درمیان میں آگیا اور فرشتہ چلا گیا اور میں شیطان کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔"

یہ فرمانے کے بعد آپ نے فرمایا:

"تین باتیں ایسی ہیں جو بالکل حق ہیں۔ جس بندے پر کوئی ظلم کیا جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس ظلم کا بدلہ نہ لے تو اللہ تعالیٰ اس کی زوردار مدد کریں گے اور جو آدمی تعلق پیدا کرنے کے لیے ہدیہ دینے کا دروازہ کھولتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے مال کو خوب بڑھا دیتے ہیں اور جو مال بڑھانے کی نیت سے مانگنے کا دروازہ کھولتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے مال کو کم کر دیتے ہیں۔"

O

حضرت عبداللہ بن عمر ؓ نے حضرت مقداد ؓ کو برا بھلا کہہ دیا۔ حضرت عمر ؓ کو پتا چلا تو آپ نے فرمایا:

"اگر میں عبداللہ کی زبان نہ کاٹوں تو میرے اوپر نذر واجب ہے۔"

اب لوگوں نے حضرت عمر ؓ سے اس سلسلے میں بات کی اور حضرت عبداللہ کو معاف کرنے کے لیے کہا۔ حضرت عمر ؓ نے فرمایا:

"مجھے اس کی زبان کاٹنے دو، تاکہ آئندہ حضور ﷺ کے کسی صحابی کو برا بھلا نہ کہہ سکے، اور یہ مستقل قانون بن جائے اور جس پر میرے بعد بھی عمل ہوتا رہے کہ جو شخص حضور ﷺ کے کسی صحابی کو گالی دیتا ہوا پایا گیا، اس کی زبان ضرور کاٹی جائے گی۔"

O

ایک مرتبہ ایک شخص نے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس ایک دوسرے آدمی کی برائی کی۔ آپ نے فرمایا:

"میرے پاس سے اٹھ جاؤ، تمہارے کلمہ شہادت کا اعتبار نہیں۔"

اس شخص نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔"

آپ نے فرمایا: "تم قرآن کا مذاق اڑا رہے ہو۔ جو قرآن کے حرام کردہ کاموں کو حلال سمجھے، وہ قرآن پر ایمان نہیں لایا۔"

مطلب یہ تھا کہ قرآن میں مسلمان کی غیبت کو حرام قرار دیا گیا ہے اور تم غیبت کر رہے ہو۔

O

حضرت خالد بن ولید ؓ اور حضرت سعد ؓ کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوگئی۔ پھر حضرت خالد بن ولید ؓ وہاں سے چلے گئے۔ حضرت سعد ؓ کے پاس بیٹھے ایک شخص نے حضرت خالد بن ولید ؓ کی برائیاں شروع کر دیں۔ اس پر حضرت سعد ؓ نے اسے جھڑک دیا اور فرمایا:

"چپ رہو! ہمارے درمیان جو بات ہوئی تھی، وہ وہیں ختم ہوگئی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر ہمارے دین تک نہیں پہنچ سکتی۔"

یعنی اس جھگڑے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کی برائیاں بیان کر کے اپنے دین کا نقصان نہیں کر سکتے۔

O

سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ نے آپ ﷺ سے حضرت صفیہ ؓ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دی جس سے غیبت کا پہلو نکلتا تھا۔ (یعنی وہ چھوٹے قد والی ہیں) آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

"اے عائشہ! تم نے ایسی بات کہہ دی کہ اگر اسے سمندر میں ملا دیا جائے تو یہ بات اس کے پانی کے مزے کو خراب کر دے۔"

O

ایک مرتبہ حضرت عائشہ ؓ نے کسی آدمی کی نقل اتار دی۔ آپ نے ان سے فرمایا:

مختصر پُراثر

حضرت محمد واسع رحمہ اللہ کے پاؤں میں زخم آ گیا۔ کسی نے ان سے کہا:

''حضرت آپ کے اس زخم کو دیکھ کر آپ سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔''

آپ نے فرمایا:

''جب سے یہ زخم ہوا ہے، میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ یہ کیا کم ہے کہ یہ زخم آنکھ میں نہیں، پاؤں میں ہے۔''

○

حضرت بہلول رحمہ اللہ کسی علاقے سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے ایک بچے کو روتے دیکھا۔ جب کہ وہاں موجود دوسرے بچے اخروٹوں سے کھیل رہے تھے۔ انھوں نے خیال کیا، اس بچے کے پاس اخروٹ نہیں ہیں، اس لیے رو رہا ہے، آپ نے اس بچے سے کہا:

''بیٹا رو نہیں، میں تمھیں بھی اخروٹ لے دیتا ہوں۔''

یہ سن کر اس بچے نے کہا:

''اے بہلول! ہم دنیا میں کوئی کھیلنے کے لیے آئے ہیں؟''

حضرت بہلول رحمہ اللہ کو یہ امید نہیں تھی کہ بچہ ایسا جواب دے گا۔ انھوں نے اس سے پوچھا:

''پھر کیا کرنے آئے ہیں۔''

بچے نے جواب دیا:

''اللہ کی عبادت کرنے کے لیے آئے ہیں۔''

آپ نے اس سے کہا:

''بیٹے! ابھی تم بہت چھوٹے ہو، تمہارے غم کی یہ چیز نہیں ہے، ابھی تو اس منزل پر پہنچنے میں بہت وقت ہے۔''

بچے نے جواب دیا:

''آپ مجھے دھوکا نہ دیں، میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے، وہ صبح جب آگ جلاتی ہے تو پہلے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جلاتی ہے، بعد میں بڑی لکڑی رکھتی ہے، اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں دوزخ مجھ سے نہ جلائی جائے اور میرے اوپر بڑوں کو نہ ڈال دیا جائے۔''

یہ سن کر بہلول بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

○

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک چور کو لایا گیا۔ شریعت کے مطابق آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اس حکم کو سنتے ہی اس نے کہا:

''اے امیر المومنین! اللہ کی قسم میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی۔ مجھے معاف کر دیں۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''عمر کے رب کی قسم! تو جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے پہلے گناہ کی بنا پر اسے نہیں پکڑتا۔''

اس مجلس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ آپ نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کی تائید کی۔ پھر چور کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ ہاتھ کاٹے جانے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور پوچھا:

''میں تمھیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ تم نے کتنی مرتبہ چوری کی ہے۔''

اس نے جواب دیا: ''21 مرتبہ۔'' (حافظ نوید احمد عجمی۔ بہبودی اٹک)

○

خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ ایک مرتبہ بیت اللہ تشریف لے گئے۔ وہاں انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ غلافِ کعبہ کو پکڑ کر دعا مانگ رہا ہے۔ آپ نے اس کے دل کی طرف توجہ کی تو دیکھا کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ سے غافل تھا، کیوں! اس لیے کہ اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ جو میرے ساتھی آئے ہوئے ہیں، وہ مجھے دیکھ لیں کہ میں غلافِ کعبہ پکڑ کر دعا مانگ رہا ہوں۔

اس کے بعد خواجہ صاحب کو منیٰ جانا پڑا۔ وہاں انھوں نے ایک دکان دار کو دیکھا۔ اس کے گرد گاہکوں کا ہجوم تھا۔ آپ نے اس کے دل کی طرف توجہ کی تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے بھی اللہ رب العزت کی یاد سے غافل نہیں تھا۔

(اہلیہ حافظ محمد امیر معاویہ۔ گوجرانوالہ)

''اے عائشہ! مجھے یہ بات پسند نہیں کہ مجھے اتنا، اور اتنا مال مل جائے، تم میرے سامنے کسی کی نقل اتار دو۔''

(یعنی کسی کی نقل اتارنا اتنا برا ہے کہ بدلے میں زیادہ سے زیادہ مال لینا بھی قبول نہ کروں)

○

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہو گیا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس زاید اونٹ تھا۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''تم صفیہ رضی اللہ عنہا کو ایک اونٹ دے دو۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کہا:

''میں اور اس یہودن کو اونٹ دوں؟''

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ایک یہودی کی بیٹی تھیں۔ جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے یہ بات کہی تو آپ ان سے ناراض ہو گئے۔ آپ نے تقریباً دو اڑھائی ماہ تک ان سے بات نہ کی، نہ ان کے ہاں گئے۔

○

حضور نبی کریم ﷺ کے مرض الوفات میں ازواجِ مطہرات آپ کے پاس جمع ہوئیں۔ ایسے میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

''اللہ کی قسم! میری دلی تمنا ہے کہ آپ کو جو مرض ہے، وہ مجھے ہوتا۔''

دوسری ازواجِ مطہرات نے ان کی اس بات کو سرسری خیال کیا اور ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے انھیں اشارہ کرتے دیکھ لیا۔ آپ نے ان سب سے فرمایا:

''تم سب کلی کرو۔''

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا:

''اے اللہ کے رسول! ہم کس لیے کلی کریں۔''

آپ نے فرمایا:

''تم نے ابھی صفیہ کے بارے میں جو ایک دوسری کو آنکھ سے اشارہ کیا ہے، اس کی وجہ سے تم نے مردار گوشت کھایا ہے، اس لیے کلی کرو۔ اللہ کی قسم! یہ اپنی بات میں سچی ہیں۔''

یعنی حضرت صفیہ نے یہ بات دل سے کہی ہے۔

○

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم حضور ﷺ کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک آدمی اٹھ کر چلا گیا۔ صحابہ میں سے کسی نے کہہ دیا۔

''یہ آدمی کس قدر کمزور ہے، کس قدر عاجز ہے۔''

یہ سن کر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''تم نے اپنے ساتھی کی غیبت کی ہے اور اس کا گوشت کھایا ہے۔'' (جاری ہے)

4 تصویر کی دھمکی

''ارے توبہ توبہ، ہم اپنے سے بڑی عمر کے آدمیوں کو بے وقوف بنانا گناہ سمجھتے ہیں جناب ...'' آفتاب نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''خیر، سنو... میری معلومات کیا ہیں ... مسٹر گھوش ایک قفل شکن ہے ... کئی بار جیل کی ہوا کھا چکا ہے ... ابھی چند ہفتے پہلے ہی جیل سے رہا ہوا ہے ... ہم اس کی تاک میں ہیں کہ کب یہ کہیں کوئی واردات کرے اور کب ہم اسے پکڑیں ... دوسرا آدمی شابو اس سے پہلے بھی دو تین ملاقاتیں کر چکا ہے، یہ اس قصبے میں چند ماہ پہلے ہی نظر آیا تھا ... ایک ہوٹل میں رہتا ہے ... میں نہیں جانتا، اس کا کاروبار کیا ہے ... مسٹر گھوش کے تعاقب کے سلسلے میں ہی اس پر نظر پڑی تھی ... اگر آپ دونوں مجھے یہ بتا سکیں کہ گھوش اور شابو کس معاملے پر بات چیت کر رہے تھے تو میں آپ لوگوں کی نگرانی نہیں کراؤں گا، ورنہ اسی وقت سے آپ لوگوں کی نگرانی شروع ہو جائے گی اور جونہی آپ نے کسی غلط کام میں ہاتھ ڈالا، آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا ...'' یہاں تک کہہ کر انوار صدیقی خاموش ہو گیا۔

''لیکن جناب، ہم کوئی غلط کام کرنے ہی کیوں لگے۔'' آصف نے بُرا سا منہ بنایا۔

''خیر! آپ لوگوں کی مرضی، میں تو آپ کی بھلائی چاہتا تھا ...'' اس نے کندھے اچکائے اور اپنا ہیٹ سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا ... پھر دروازے کی طرف بڑھا ... دروازے پر پہنچ کر رُکا اور ان پر نظریں جماتے ہوئے بولا:

''اگر کسی وقت آپ مجھے کچھ بتانے کا ارادہ کریں تو میرا نمبر کاؤنٹر سے معلوم کر لیجیے گا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا ... دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے ...

''اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد آصف نے کہا۔

''نیک آدمی جان پڑتا ہے۔'' آفتاب مسکرایا۔

''میں نے اس کی نیکی اور بدی کے بارے میں نہیں پوچھا۔'' آصف نے اُسے بری طرح گھورتے ہوئے کہا۔

''تو پھر کس چیز کے بارے میں پوچھا ہے؟''

اشتیاق احمد

''یہ آخر کس چکر میں ہے؟''

''صاف ظاہر ہے، مسٹر گھوش کے چکر میں ہے۔''

''ایک قفل توڑنے والے کے چکر میں ایک ڈی۔ ایس پی، بات کچھ عجیب سی لگتی ہے۔'' آصف نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو پھر یہ دراصل مسٹر شابو کے چکر میں ہوگا ... ارے لیکن ہم نے اس سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ ہمارے کمرے میں کس طرح داخل ہوا ہوگا ...'' آفتاب نے چونک کر کہا۔

''یہ کیا مشکل ہے ... کاؤنٹر سے چابی لے آیا ہوگا ... ظاہر ہے، ہوٹل والے اسے انکار نہیں کر سکتے۔''

''ہوں، سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔'' آفتاب بولا۔

''کرنا کرانا کیا ہے، سردار ہارون کے گھر رات کے بارہ بجے چلیں گے۔'' آصف نے سینہ تان کر کہا۔

''ان حالات میں بھی، جب کہ قصبے کا ڈی۔ ایس پی ٹوہ میں ہے۔''

''وہ ہماری ٹوہ میں نہیں، مسٹر گھوش یا شابو کی ٹوہ میں ہے۔''

''اور ہم شابو صاحب کا کام کرنے نہیں جا رہے۔''

''بھئی اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو میں تنہا چلا جاؤں گا۔''

''آئے بڑے دلیر کہیں کے۔'' آفتاب نے بُرا سا منہ بنایا۔

''میری سمجھ میں اب تک ایک بات نہیں آئی ... آخر انکل نے ہمیں یہاں کیوں بھیجا ہے اور وہ بھی میک اپ میں۔''

''ان سے پوچھ کر بتاؤں گا۔'' آفتاب مسکرایا۔

''لاحول ولا قوۃ، تم سے کسی سیدھے جواب کی امید رکھنا ہی فضول ہے۔'' آصف تلملا اُٹھا۔

''جب تمہیں معلوم ہے کہ امید رکھنا فضول ہے تو پھر کیوں امید رکھتے ہو؟''

''پاگل پن ہے میرا۔'' آصف نے تقریباً چلا کر کہا۔

''میں بہرہ نہیں ہوں۔''

''انکل نے ہمیں یہاں بلاوجہ نہیں بھیجا ... ہم اگر اس معاملے میں اُلجھ گئے تو کہیں وہ کام نہ رہ جائے، جس کے لیے انھوں نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔'' آصف نے سوچنے کے انداز میں کہا۔

''ہاں! اب تم نے سوچی ہے ڈھنگ کی بات۔'' آفتاب خوش ہو کر بولا۔

''لیکن مصیبت یہ ہے کہ انھوں نے تو ہمیں کچھ کرنے کے لیے کہا ہی نہیں ... صرف اتنی ہدایت دی ہے کہ اس ہوٹل میں ٹھہر جائیں ... اب جب تک ان کی دوسری ہدایات نہیں مل جاتیں، ہم آزاد ہیں ... اس دوران اگر ہم کوئی کام دکھا دیں تو اس میں کیا حرج ہے ...'' آصف بولا۔

''حرج تو کوئی نہیں، لیکن کام دکھاتے دکھاتے کہیں ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس

چھوٹے قد والے دل چھوٹا نہ کریں

• کیا چھوٹا قد آپکو احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے؟
• چھوٹے قد اور کمزور صحت کیوجہ سے اکثر بچے بچیوں کے رشتے نہیں ہو پاتے۔
• چھوٹے قد اور کمزور صحت کی وجہ سے نوکری نہیں مل پاتی۔
• چھوٹے قد کی وجہ سے لڑکیاں سسرالیوں اور شوہر کے طعنوں کا نشانہ بنتی ہیں۔
• چھوٹا قد اور کمزور صحت بچوں کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیتا ہے ـــــ تو پریشان ہونا چھوڑیئے

آپ میڈلیسن کا ساتھ دیں • میڈلیسن آپکا ساتھ دے گی

بچوں کے چھوٹے قد سے پریشان نہ ہوں 30 سال تک کے لڑکے لڑکیاں اپنے قد میں اضافہ کر سکتے ہیں جوان ہونیوالے لڑکے لڑکیوں کو پروٹین کی بہت ضرورت ہوتی ہے اس کی کمی کیوجہ سے قد بڑھنا رک جاتا ہے صرف 10 فیصد ہارمونز کی کمی بیشی سے ایسا ہوتا ہے۔ اس دوران لحمیات زیادہ کریں۔ تاکہ بڑھوتری جلد ممکن ہو سکے۔

(IdealHeight)
آئیڈیل ہائیٹ کورس

اب قد بڑھانا بے حد آسان
قد میں یقینی اضافہ
چھوٹے قد والوں کے لئے ملبی خوشخبری
کورس 1 ماہ قیمت 1600 روپے

قد بڑھنے کا شیڈول
12 سے 18 سال تک عمر: قد میں 6 انچ اضافہ
19 سے 24 سال تک عمر: قد میں 4 انچ کا چانس
25 سے 30 سال تک عمر: قد میں 2 انچ اضافہ۔

کورس بذریعہ V.P روانہ کیا جاتا ہے خرچہ 50 روپے
صبح 11 بجے سے 6 بجے تک کال کر کے VP منگوا سکتے ہیں
0313-5022903—0334-0700800
WWW.deva Pk Com

گرتے بال، سکری خشکی، چہرے پر کیل چھائیاں، داغ، دھبے، فالتو بال، کالی رنگت، جوڑوں کا درد، گردہ پتھری، معدہ، دمہ، ہر قسم کی کمزوری کا مکمل علاج

اپنی صحت کے بارے میں مفت کتابچہ منگوانے کیلئے اپنا نام پتہ SMS کریں 0313-5022903

جائیں اور پھر یہ نہ ہو کہ جب ابا جان کی ہدایت یہاں پہنچے یا وہ خود یہاں پہنچیں تو ہم غائب ہوں۔"

"سنو بھائی، جب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کا کیا ڈر۔" آصف بولا۔

"میں جانتا ہوں، یہ ضرب المثل ہے۔" آفتاب مسکرایا۔

"مطلب یہ کہ اب ہم اس کام میں ہاتھ ڈال چکے ہیں ... مسٹر شابو سے تصویروں والا لفافہ لاکر دینے کا وعدہ کر چکے ہیں ... لہٰذا پیچھے نہیں ہٹیں گے ... چاہے کچھ ہو جائے۔"

"بہت اچھا جرنیل صاحب! اب میں بھی تمہارے ساتھ آگے ہی بڑھوں گا اور ثابت کردوں گا کہ میں تم سے کسی طرح بھی بزدل نہیں۔"

"ویری گڈ، یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔" آصف نے مسکرا کر کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی ... دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر آصف نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا ... انھوں نے دیکھا، دروازے پر ایک بیرا کھڑا تھا...

"کیا بات ہے؟" آصف نے نرم آواز میں پوچھا۔

"آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔" اس نے ٹرے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ٹرے میں ایک لفافہ رکھا تھا۔ آصف نے حیرت زدہ انداز میں ٹرے میں سے لفافہ اٹھایا ... بیرا الٹے قدموں چلا گیا...

آصف نے لفافہ چاک کیا اور اس میں سے کاغذ نکالا ... کاغذ پر لکھا تھا...

"تم لوگ آگ سے کھیل رہے ہو۔ اس کھیل میں تمہارا سب کچھ جل جائے گا۔ ابھی وقت ہے، سنبھل جاؤ، باز آجاؤ۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

تحریر کے نیچے کسی کا نام نہیں تھا... وہ حیرت زدہ سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے...

O

کمرے میں چند لمحے تک کے لیے گہری خاموشی چھائی رہی، پھر آصف نے کہا:

"خدا جانے یہ پیغام کس نے لکھا ہے ... ہمیں بیرے سے معلوم کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، اسے یہیں بلالو۔" آفتاب بولا۔

انھوں نے گھنٹی بجا دی ... تھوڑی دیر بعد وہی بیرا موجود ہوا ... اس کے چہرے پر کوئی حیرت نہیں تھی ...

"جی فرمایئے۔"

"یہ پیغام آپ کو کس نے دیا تھا؟"

"ایک شخص آیا تھا اور کاؤنٹر پر یہ لفافہ دیتے ہوئے آپ کے کمرے کا نمبر بتایا تھا... کاؤنٹر مین نے لفافہ میرے حوالے کر دیا... کیونکہ آپ کا کمرہ میرے چارج میں ہے۔"

"کیا آپ اس شخص کا حلیہ بتا سکتے ہیں؟" آصف نے پوچھا۔

"میں نے اسے نہیں دیکھا۔" اس نے کہا۔

"لیکن کاؤنٹر کلرک نے تو دیکھا تھا، اگر آپ ہمیں اس کا حلیہ بتا دیں تو ہم آپ کے حد درجے شکر گزار ہوں گے ... یہ ایک نیک کام ہے۔"

"اچھی بات ہے ... میں کاؤنٹر مین سے معلوم کر کے آپ کو فون پر بتائے دیتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔" آفتاب نے خوش ہو کر کہا اور بیرا چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی ... دوسری طرف سے بیرا کہہ رہا تھا:

"جناب، وہ ایک درمیانے قد کا آدمی تھا... اس کی آنکھیں نارنجی تھیں اور جسم پتلا دبلا تھا۔"

"کیا؟" آفتاب کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا، پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا بات ہے؟" آصف نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"اس نے شابو کا حلیہ بتایا ہے۔" آفتاب بولا۔

"اوہ، لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے، شابو ہی تو ہم سے یہ کام لینا چاہتا ہے، پھر بھلا وہ ہمیں کیوں روکے گا۔"

"یہ واقعی عجیب ترین بات ہے ... آصف، میرا خیال ہے، ہم کسی گہرے معاملے میں پھنسنے والے ہیں۔"

"تو پھر، کیا تم چاہتے ہو ... ہم قدم پیچھے ہٹالیں؟"

"نہیں، اب قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔" آفتاب نے سرد آواز میں کہا۔

"ویری گڈ، تمہارے منہ سے یہی الفاظ سننے کا خواہش مند تھا، اب ہم یہ جان کر رہیں گے کہ یہ چکر کیا ہے۔" آصف خوش ہو کر بولا۔

"کاش، ابا جان ہمیں یہ بتا دیتے کہ ان کا ہمیں یہاں بھیجنے کا مقصد کیا ہے ... اس صورت میں ہمیں کوئی فکر نہ ہوتی۔"

"خیر، کوئی بات نہیں! آؤ تیاری کریں۔" (جاری ہے)

دو خبریں

یہ بچوں کا اسلام کی دو خبریں ہیں جو آپ کا مزا چار بالا کرنے آئی ہیں، یعنی دو باتیں جمع دو خبریں ہوئیں۔ چار بالا جیسے دو دو نے چار، اُمید ہے مختصر ہونے کی وجہ سے زود ہضم بھی ثابت ہوں گی، ہاں بس ایک ایک دو گیارہ یاد میں سونہ سمجھیے گا، ورنہ اوپر سے پورے نیوز چینل کی پھکی استعمال کرنا پڑ جائے گی اور اس کے ذمے دار آپ خود ہوں گے۔ "اشتیاق احمد کا چھپایا گیا خزانہ حاصل کر لیا گیا ہے" جی ہاں! یہ وہ خزانہ تھا جسے یہ بزرگ ذہن کے کسی کونے کھدرے میں چھپائے رکھتے تھے، اس خزانے کے منجمد ہو جانے کے باعث قارئین کو خطوط کے آئینہ میں جواباً کچھ نظر نہیں آتا تھا اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے تھے، قارئین نے اپنی اس عجیب مصروفیت کہ وہ اپنا منہ لے کر بیٹھے رہیں کا کیس اپنے وکیل شاہد فاروق کے حوالے کر دیا جو انھوں نے پوری مہارت سے لڑا اور ایک اطلاع کے مطابق ان کی طرف سے دی جانے والی کنجوسی کی دھمکی کام کر گئی اور اشتیاق احمد نے وہ خزانہ واپس خطوط کا آئینہ میں پیش کر دیا۔

"سالنامہ کا استقبال" ہمارے سراغ رساں نمایندے کا کہنا ہے کہ لکھاری حضرات نے سالنامے کے استقبال کے لیے اپنی کسی مُٹھیں پوری طرح کھول لی ہیں۔ خاص طور پر حافظ عبدالجبار صاحب نے تو دونوں پَر معذرت کے ساتھ دونوں بازو پھیلا لیے ہیں، تاکہ سالنامے سے اچھی طرح بغل گیر ہو سکیں، چونکہ مدیر لوگوں کو خالی ہاتھ آیا مہمان (لکھاری) ایک آنکھ نہیں بھاتا، اس لیے انھوں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر (تحریری) گٹھریاں بھی تیار کر لی ہیں۔ ہمارے مخصوص نمایندے کا کہنا ہے کہ حافظ صاحب کو اتنا فکر مند ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ وہ تو صرف "اگر مگر" بھی کر لیں تو کام چل جائے گا اور بڑے عرصے تک قارئین اس "اگر مگر" کی جکڑ بندیوں سے نکل نہیں پائیں گے، بلکہ "مگر مگر مگر" کرتے پھرتیں گے، ادھر قارئین کو بھی پیش بندی کر لینی چاہیے، کہیں "اگر مگر" کے بعد اس بار وہ "بھول بھلیاں" ہی لے کر نہ حاضر ہو جائیں۔ اسی کے ساتھ دو خبریں ختم ہوئیں۔

محمد اقبال۔ کراچی

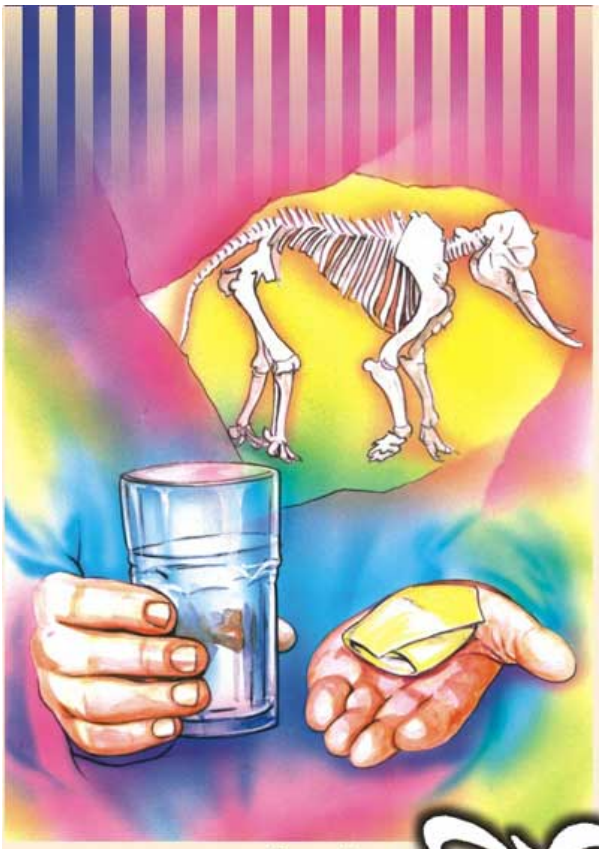

وہ شخص

حافظ حمزہ شہزاد۔ سرائے سدھو

گاڑی سے اترتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ صبح کے دس بجے کا وقت تھا۔ گرمی عروج پر تھی۔ جون کا مہینا تھا اور سورج آگ برسا رہا تھا۔ ملتان کی گرمی تو ویسے بھی مشہور ہے۔ جھنگ کا اے سی ٹائم مجھے اتار کر کہیں آگے روانہ ہوگیا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ملتان شہر کافی بدل گیا تھا۔ کچھ دیر تو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کس طرف جانا ہے۔ کچھ پرانی نشانیوں سے معلوم ہوا کہ میں اس وقت وہاڑی چوک میں کھڑا ہوں۔ مغرب کی طرف پاک گیٹ، حرم گیٹ، دہلی گیٹ وغیرہ کی طرف راستہ جاتا ہے اور شمال کی طرف چوک کمہارانوالا اور اندرون شہر کی طرف گاڑیاں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

میں نے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو انگلی کے ساتھ صاف کر کے جھٹکا اور ان تانگوں کی طرف بڑھ گیا جو ملتان کے مشہور ''کھٹیوں'' کی طرف جاتے تھے۔ آج بھی ملتان میں زمانہ قدیم اور جدید کا ملاپ دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ جب بھانت بھانت کی گاڑیاں نہیں ہوتی تھیں، تب یہی تانگے والے چونی اٹھنی لے کر مسافروں کو منزل مقصود تک پہنچایا کرتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی پک اپ نما گاڑیاں بھی تیار کھڑی تھیں مگر میں ان کو نظر انداز کرتا ہوا تانگے میں جا بیٹھا۔ جلد ہی تانگا سواریو ں سے بھر گیا تو تانگہ بان نے چابک لہرایا، لگاموں کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا تو گھوڑا ملتان کی کالی سیاہ سڑک پر سرپٹ دوڑنے لگا۔

میں نے کافی عرصہ بعد شہر میں قدم رکھا تھا۔ حرم گیٹ سے ملحقہ آبادی میں ایک عزیز سے ضروری ملاقات کرنے کی خاطر تین گھنٹے کا سفر کر کے جھنگ سے ملتان پہنچا تھا۔ تقریباً بیس منٹ کے سفر کے بعد تانگے نے مجھے حرم گیٹ اتار دیا۔ میں نے تانگہ بان کو کرایہ ادا کیا اور حرم گیٹ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر ایک آواز نے مجھے رکنے پر مجبور کر دیا:

''بھائی جان! ٹائم کیا ہوا ہے؟''

میں نے دیکھا کہ وہ ایک پختہ عمر کا معزز شخص تھا۔ اس نے سفید رنگ کا بے داغ لباس پہنا ہوا تھا اور کسی کھاتے پیتے گھرانے کا نظر آتا تھا۔ میں نے اپنے موبائل سے ٹائم دیکھا اور اسے بتایا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھتے ہوئے چونک کر مڑا:

''بھائی جان! ایک ذاتی سوال کروں؟''

میں نے بے اختیار اثبات میں سر ہلا دیا:

''کیا آپ کو ہیپاٹائٹس ہے؟''

''کیا؟'' اس کے بے ہودہ سوال پر مجھے غصہ آ گیا تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کیا اور آگے چلنے لگا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہولیا:

''آپ تو ناراض ہوگئے۔ اصل میں آپ کی آنکھیں پیلی زرد ہیں۔ اس لیے مجھے شک ہوا۔ آپ کو پیشاب بھی جل جل کر پیلا زرد آتا ہوگا۔''

چلتے چلتے اس کی بات سن کر میں چونک گیا۔ واقعی کئی دنوں سے میرے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ وہ شخص کہہ رہا تھا:

''کبھی کبھی آپ کو اٹھتے بیٹھتے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ متلی میں بھی ہلکا ہلکا درد رہتا ہے اور کمر درد کی شکایت بھی ہے۔'' وہ میرے بارے میں سو فیصد ٹھیک باتیں کر رہا تھا: ''رات کو سوتے ہوئے تھکن کے مارے آپ کا جوڑ جوڑ دکھتا ہے۔''

''ہاں!'' میں نے اقرار کیا: ''آپ کی سب باتیں درست مگر آپ کا یہ کہنا کہ مجھے ہیپاٹائٹس ہے، بالکل غلط ہے۔''

''اوہ سر! آپ تو ناراض ہوگئے۔'' وہ مسلسل میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کی باتیں سن کر مجھے بھی اپنی صحت کے حوالے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''جناب! اس مرض کو آپ معمولی نہ سمجھیں۔ یہ خاموش قاتل ہوتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں ہر پانچواں آدمی اس مرض میں مبتلا ہے مگر آپ خوش قسمت ہیں۔''

''کیا؟'' میں حیرت کے مارے رک گیا: ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''سر! آپ مجھے مسافر معلوم ہوتے ہیں۔'' وہ معزز آدمی خاصا چرب زبان واقع ہوا تھا۔ ''آپ مجھے غلط مت سمجھیں۔ میں ملتان کا ایک بڑا حکیم ہوں۔ آپ ایک منٹ کولڈ ڈرنک والی دکان میں آ کر میری بات سن لیں۔''

میں نے کندھے اچکائے اور اس کے ساتھ کولڈ ڈرنک والی دکان میں داخل ہوگیا۔ اس نے دو بوتلیں منگوائیں اور بولنے لگا:

''سر! آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی بیماری ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ اس کے علاوہ مزید خوش قسمتی یہ ہے کہ آپ کی مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ مانتے ہیں کہ جو علامات میں نے بتائی ہیں، وہ آپ میں موجود ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں!''

''سر! مجھے نہیں معلوم کہ آپ ملتان کس کام آئے ہیں۔ کتنے دن رکیں گے۔ کس سے ملیں گے مگر میری ایک درخواست ہے کہ آپ میری تجویز کی ہوئی دوا یہاں سے ضرور خرید کر جائیں۔ انشاءاللہ زندگی بھر آپ مجھے دعا دیں گے۔''

یہ اس کی ''مہمان نوازی'' کا اثر تھا یا ''خوش اخلاقی'' کا یا پھر چرب زبانی کا کہ میں نے خود کو دوا خریدنے کے لیے تیار پایا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میں واقعی ہیپاٹائٹس کا مریض بننے جا رہا ہوں اور مجھے جلد ہی اس مرض سے نجات حاصل کرنا ہے۔ میں نے بے شمار اپنے جاننے والوں کو اس مرض میں مبتلا ہو کر علاج کرواتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ میں کولر اٹھائے ہر روز ڈاکٹر سے ٹیکا لگوانے بھاگتے تھے۔ ہر ماہ ضلع کے بڑے سرکاری ہسپتال میں جاتے تھے اور ہیپاٹائٹس کی ویکسین حاصل

کرتے تھے۔ میں کانپ اٹھا:

''ٹھیک ہے بھائی!'' میں نے آمادگی ظاہر کی: ''مگر مجھے بہت جلدی ہے۔''

''پندرہ منٹ میں آپ کی دوا تیار ہو جائے گی۔ آئیں میرے ساتھ!'' وہ بہت پرجوش ہو گیا تھا۔

وہ ''معزز شخص'' مجھے حرم گیٹ سے باہر ایک ''ہاتھیوں والی'' دکان پر لے گیا۔ وہ ایک بہت بڑی پنسار کی دکان تھی۔ اس دکان کے بورڈ پر ''ملتان کی مشہور ہاتھیوں والی دکان'' لکھا ہوا تھا۔ دکان پر ہڈی کے ساتھ بنائے ہوئے دو ہاتھیوں کے ڈھانچے بھی رکھے ہوئے تھے۔ وہ شخص دکان دار کو مختلف جڑی بوٹیاں نکالنے کا کہنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ مطلوبہ دوا کا وزن بھی بتاتا جا رہا تھا۔ پانچ منٹ بعد ہی کاؤنٹر پر کئی اقسام کی ''جڑی بوٹیاں'' اکٹھی ہو چکی تھیں۔ مجھے ساتھ لانے والے شخص نے دکان دار کو وہ دوائیں پیسنے کے لیے کہا تو مستعد کاؤنٹر مین نے تمام دوائیں گرینڈر میں ڈالیں اور چند منٹ بعد ہی ان جڑی بوٹیوں کا آمیزہ ایک شیشے کے جار میں میرے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اس شخص نے کاغذ کے آٹھ حصے کیے اور تھوڑی تھوڑی دوا ان کاغذوں میں ڈال کر پڑیاں بنائیں۔

''یہ تقریباً چھ ماہ کی پھکی ہے۔'' وہ معزز شخص کہہ رہا تھا: ''جتنی پھکی میں نے ایک پڑیا میں ڈالی ہے، آپ کو اتنی ہی دوا تینوں ٹائم کھانے کے بعد استعمال کرنی ہے اور گنے کے رس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا ہے۔''

''یہ دوا کوئی نقصان تو نہیں پہنچائے گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں نہیں ہرگز نہیں!'' وہ شخص بولا: ''آپ بے فکر ہو کر دوا استعمال کریں۔ اللہ آپ کو شفا دے گا۔''

دکان دار نے شیشے کا جار ایک شاپر میں ڈال کر میرے حوالے کیا اور ساتھ ہی بل کا کاغذ بھی۔ میں نے بل پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور بری طرح چونک اٹھا۔ پندرہ ہزار آٹھ سو روپے کا بل بن چکا تھا۔

''اتنا زیادہ بل؟'' میں بڑبڑایا۔

''نہیں جناب!'' دکان دار بولا: ''جو جڑی بوٹیاں آپ کو دی گئی ہیں، سمجھیں آپ کو مفت مل گئی ہیں۔ یہ بہت نایاب جڑی بوٹیاں ہیں۔''

''مگر میں اتنی مہنگی دوا نہیں خرید سکتا۔'' میں نے خود کو کہتے ہوئے پایا۔

''دوا تو آپ خرید چکے جناب!'' ایک کرخت آواز ابھری تو میں نے چونک کر دیکھا۔

ہاتھیوں والی دکان کا خوف ناک شکل والا گارڈ کندھے سے گن لٹکائے میرے نزدیک کھڑا تھا۔

''جلدی سے بل ادا کرو۔ جناب!'' گارڈ میرے سر پر سوار ہو گیا۔

میں نے بے بسی سے ادھر اُدھر دیکھا اور بری طرح چونک گیا۔ میرے ساتھ آنے والا ''معزز شخص'' گدھے کے سر سے سینگ کی مانند غائب ہو چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے بڑی ہوشیاری سے گھیر لیا گیا ہے۔ اب روپے ادا کر کے ہی جان چھوٹنے والی تھی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوہ نکالا۔ ستر ہزار کے قریب روپے بٹوے میں موجود تھے۔ میں مطلوبہ پیسے گن ہی رہا تھا کہ گارڈ نے بٹوہ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا:

''روپے گننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ سخت لہجے میں بولا: ''پہلے دوا کی ایک پڑیا کھا لو۔''

''نن... نن... نہیں!'' میں نے احتجاج کیا۔ میرا احتجاج بے سود گیا۔ گارڈ، کاؤنٹر مین اور دکان کے مالک نظر آنے والے شخص نے مل کر مجھے بے بس کیا اور پڑیا میرے منہ میں ڈال کر اوپر سے زبردستی پانی پلا کر دوا میرے حلق کے نیچے اتار دی۔

جیسے ہی دوا میرے معدے میں پہنچی شدید جلن نے مجھے گھیر لیا۔ میں اپنا بٹوہ اور دوا والا جار بھول کر دکان کے باہر بھاگا۔ مجھے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا اور معدے میں ہونے والی شدید جلن مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کر رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے عزیز کو فون کیا اور فوراً حرم گیٹ پہنچنے کو کہا۔ چند منٹ میں ہی میری حالت غیر ہو گئی اور میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتا چلا گیا۔

ہوش آیا تو میں نے خود کو نشتر ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پایا۔ معلوم ہوا کہ مجھے ایک زود اثر زہر کھلایا گیا تھا۔ ریسکیو والوں نے نشتر ہسپتال پہنچا کر مجھے یقینی موت کے منہ سے بچا لیا تھا۔ میرا معدہ فوراً واش کر دیا گیا تھا۔ زہر کے اثرات کو ختم کرنے والی ادویات میرے جسم میں منتقل کی جا رہی تھیں۔ میرا عزیز بھی ہسپتال پہنچ چکا تھا۔

چند دنوں میں ہی میں تندرست ہو گیا۔ اس دوران میں نے اپنے عزیز کے تعاون سے ملتان کے تھانہ ''حرم گیٹ'' میں ''ہاتھیوں والی دکان'' کے مالکان کے خلاف مقدمہ درج کروانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر ''عدم ثبوت'' کی بنا پر میری ایک نہیں سنی گئی۔ یقیناً پولیس والے بھی اپنا حصہ وصول کر چکے تھے۔

میں ملتان میں ایک مسافر تھا۔ مجھے اپنے کاروبار کی وجہ سے جھنگ پہنچنا لازمی تھا۔ میں اپنا مقدمہ اللہ پر چھوڑ کر جھنگ واپس آ گیا ہوں مگر یہ تحریر لکھ دی ہے، تاکہ سند رہے اور مجھ جیسے مسافروں کے کام آئے۔ مسافروں سے گزارش ہے کہ دورانِ سفر چاہے کوئی کتنا ہی بڑا آپ کا ہمدرد بن جائے، اس پر اعتماد ہرگز مت کریں اور نام نہاد حکیموں سے ہمیشہ بچ کر رہیں۔ معلوم نہیں یہ حکیم کتنے سادہ لوح مسافروں کو روزانہ گھیر کر لوٹنے کے ساتھ ساتھ موت کے منہ میں دھکیلتے ہوں گے۔

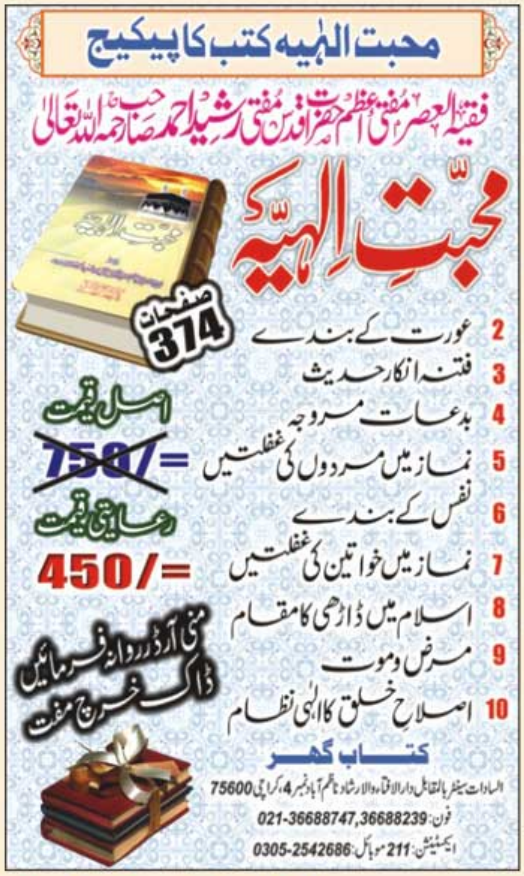

لالچ کی پٹی

سارہ الیاس۔ڈیرہ غازی خان

محلے میں داخل ہوتے ہی مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔
ہر چہرہ غمگین، ہر آنکھ اشک بار تھی۔

"الٰہی خیر! جانے کیا ہوگیا ہے؟" صدیقہ خالہ تو کل ہی ہسپتال سے فارغ ہوئی تھیں، شازیہ بتا رہی تھی کہ خوب صحت مند ہیں، لگتا ہی نہیں، بیمار تھیں، خلیفہ جی کے لڑکے کو خسرہ، اللہ نہ کرے، کتنی منتوں مرادوں کے بعد ملا ہے، دونوں میاں بیوی اسے دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں۔ خالہ کلثوم کی تاجی لڑ کر آئی ہوئی تھی، اس کے نکھٹو شوہر نے طلاق تو نہیں دے دی۔" یہ سب سوچتے سوچتے میں نیم کے پیڑ کے پاس جا ٹھہرا جسے میاں شبیر احمد روزانہ پانی دیا کرتے تھے اور یہ شعر گنگنایا کرتے تھے:

چیز تو کڑوی ہے مگر سایہ کے لیے
لوگ نیم کا پیڑ بھی آنگن میں لگا لیتے ہیں

جانے ان کا اپنا شعر تھا یا کسی شاعر کا؟ آج صبح جب میں دفتر جانے کے لیے نکلا تھا تو وہ بھی اپنے ویسپا پر تیار کھڑے تھے، اللہ بھلا کرے، مجھے لوکل بسوں میں دھکے کھانے سے بچا لیا انھوں نے۔ انھی سوچوں میں گم نیم کے پیڑ تلے کھڑا تھا، اس چوک سے دو گلیاں چھوڑ کر میرا گھر تھا۔ روزانہ دفتر سے واپسی پر اسی درخت کے نیچے ٹھہر کر سکون کے چند سانس لینا اور باہر کی پریشانی باہر چھوڑ کر مسکراتے چہرے کے ساتھ گھر جانا میرا معمول ہے۔ روزانہ یہ درخت اپنے پتے، اپنی شاخیں لہرا لہرا کر استقبال کرتا تھا مگر نجانے کیوں آج چپ چاپ کھڑا تھا۔ یوں جیسے آنسو ٹپکا دیا ہو، پانی کی بوندیں میرے چہرے پر پڑیں۔ گھبرا کر اوپر دیکھا تو ہلکے پھلکے بادلوں نے بوندا باندی شروع کر دی تھی۔ اچانک حاجی صاحب کی آواز نے مجھے اس سے آزاد کروا دیا۔ "بڑی نیک روح تھی! آسمان تک رو پڑا ہے۔" انھوں نے اپنی دکان کا شٹر گراتے ہوئے کہا اور اونچی آواز میں مجھے پکار کر بولے:

"سلیم بھائی! شبیر صاحب کے جنازے پر نہیں چلنا؟"

حیرت، غم، دکھ، درد، تکلیف ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔

"جی! ان کا انتقال؟" مجھ سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔ "ہاں جی! غالباً آپ کے ساتھ گئے تھے۔ صبح آپ کو دفتر اتار کر آگے چلے ہی تھے کہ دو سائیکل موٹر سواروں نے گولیوں سے بھون ڈالا۔" انھوں نے افسردہ لہجے میں بتایا۔ غمگین انداز میں گھر آیا۔ بریف کیس رکھ کر جنازہ گاہ چلا گیا۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ "آج پھر سے یتیم ہو گیا میں!"

"ان کے دم سے جانے کتنے گھروں میں چولہے جلتے تھے۔" "میں تو ان کی امداد کے باعث تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا۔" جنازہ پڑھ کر جب ہم لوگ واپس آ رہے تھے، یہی آوازیں کان میں پڑ رہی تھیں۔ خاص طور پر ان کے دو یتیم بھتیجوں کی حالت غیر تھی مگر سوائے صبر کی تلقین کے اور کیا بھی کیا جا سکتا تھا!

گھر واپس لوٹا تو شازیہ نم آنکھیں لیے دروازے پر کھڑی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر چپ چاپ کھانا لے آئی۔ ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ بولی:

"یاد ہے سلیم! یہ گھر بنوانے کے لیے جب رقم کی ضرورت تھی تو کوئی قرض نہیں دیتا تھا، نہ میرے بھائی، نہ تمہارے بھائی، ایسے کڑے وقت میں شبیر چچا ہی تھے جنھوں نے ہماری مدد کی تھی اور جب ہم رقم ادا کرنے گئے تھے تو کس محبت سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے تھے:

"باپ بیٹیوں کو دیا کرتے ہیں۔ بیٹیوں سے لیا نہیں کرتے۔"

"ہاں شازیہ! ایسے لوگ کم کم ہی ہوتے ہیں دنیا میں بلکہ انھی کی وجہ سے دنیا قائم ہے۔" میں نے کہا۔ وہ آنکھیں پونچھ کر برتن سمیٹنے لگی اور میں آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ ان کا دھیما دھیما چلنا، مسکرا مسکرا کر ملنا، ہلکا ہلکا بولنا، ہر اک سے محبت کرنا، چڑیوں کو دانا ڈالنا، پودوں کو پانی دینا، غریب بچوں کو پڑھانا، غریب بچیوں کی اچھی جگہ شادی کرنا، پولیس کی اعلیٰ پوسٹ پر رشوت کے بغیر رہ کر دکھانا، اسی پاداش میں نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھنا، پھر درمیانے درجے کی ایک نوکری پر لگ جانا۔ ایک ایک کر کے یہ باتیں میرے ذہن میں گھومتی جا رہی تھیں۔ پھر جانے کب کسی نے مجھے نیند کی چادر اوڑھا دی۔

منے کے رونے کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ شازیہ شاید باورچی خانے میں تھی۔ جہاں سے برتن کھٹکنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے منے کو گود میں لیا اور باہر چلا آیا۔ شازیہ نے مسکرا کر اُسے مجھ سے لے لیا۔

"شریر! ابو کی نیند خراب کر دی۔" پھر مجھے مخاطب کر کے بولی۔ "آپ نماز پڑھ آئیں۔ بس چائے تیار ہے۔" باہر نکلنے پر ایک حیرت انگیز خبر میری منتظر تھی۔ پولیس قاتل کو گرفتار کر چکی تھی۔ جائے وقوعہ پر موجود کسی شخص نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے بائیک کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ قاتل کوئی اور نہیں، ان کے بھتیجے تھے۔

حاجی رسول خان مرحوم کے قریبی عزیز تھے۔ انھوں نے رندھی ہوئی آواز میں مجھے بتایا "سچ کہتے ہیں بزرگ کہ لالچ بری بلا ہے۔ ان دونوں بدبختوں کے دل پر ہوس کا بھوت چھایا تھا۔ مرحوم انھیں سمجھاتے رہتے اور اللے تللے کرنے سے روکتے تھے۔ دونوں نے جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے ان کا پتا کاٹنے کا سوچا۔ کم عمر نادان بھی تھے، اس لیے پکڑے گئے ہیں۔ کیا ملا انھیں۔ اچھے بھلے تھے؟ بڑے کو تو اس سال میڈیکل کالج میں داخل کروایا تھا انھوں نے۔

اور میں سوچنے لگا کہ واقعی لالچ کی پٹی آنکھوں پر بندھ جائے تو پھر انسان کو کچھ نہیں سوجھتا۔ سونے کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر دے تو محبت، الفت اور پیار کی خوشبو کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ سکوں کی کھنک کانوں میں پڑ جائے تو پیار اور ہمدردی کے بول سنائی نہیں دیتے۔

خیر چونکہ میاں صاحب کا کوئی اور قریبی عزیز نہیں تھا، چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق حاجی رسول خان ان کی جائیداد کی دیکھ بھال کرنے لگے اور ان کی رقم سے دور دراز واقع گاؤں میں سکول کھلنے لگے، کنویں کھدوائے جانے لگے۔ نادار بچوں کی دیکھ بھال کی جانے لگی اور ایسے ہی کئی کام جن سے ان کی روح خوش ہو۔

اب سمجھ میں آیا کہ اتنی دولت ہونے کے بعد بھی وہ ہم جیسے عام بندوں کی طرح کیوں رہتے تھے۔ ان کی نظر آخرت پر تھی۔ کتنے خوش قسمت ہیں مرنے کے بعد بھی اعمال نامے میں نیکیاں درج ہو رہی ہیں اور وہ دونوں جانے کیا فیصلہ ہوگا، پھانسی کے پھندے پر جھولیں گے یا کم عمر ہونے کے باعث قید کاٹیں گے۔ میں سوچ رہا تھا نیم کے پیڑ تلے کھڑا۔

یہ جون 1999ء کا واقعہ ہے۔ برطانیہ کے شہر مانچسٹر میں واقع لڑکیوں کے ایک سکول کے ہال میں تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ موضوع تھا "مشہور مذہبی شخصیت" اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک بچی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا۔ اپنی تقریر کے دوران یہ بچی جب بھی لفظ "محمد" ادا کرتی تو غیر ارادی

نیوز چینل

محمد شاہد فاروق۔ ایم اے ایم ایڈ۔ پھلور

سالنامے کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے چند ہفتے غائب رہنے کے بعد دوبارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں۔ بجلی کی دیکھا دیکھی ہمارے بھی پر نکل آئے ہیں اور ہم بھی غائب رہ کر انتظار کرانے کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ مدیر صاحب غصے میں قینچی کی بجائے قینچا پکڑ کر ہمارے پر کاٹ کر ہمیں ردی کی ہالٹی میں قید کر دیں۔ ہم وضاحت کر دیں کہ یہ سب ناگہانی آفتوں کی طرح آنے والی اچانک مصروفیات کا کیا دھرا ہے کہ ایک طرف ہمیں سر کھجلانے کی فرصت نہ مل سکی تو دوسری طرف علی عثمان صاحب ہماری سیٹ پر قبضہ کر بیٹھے اور ہم ہاتھ ہی ملتے رہ گئے۔ خیر! اب ہم نے ہاتھ ملنا چھوڑ دیے ہیں اور ہاتھ دھو کر خبروں کے پیچھے پڑیں گے۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق عائشہ ریاض نے مدیر صاحب سے اپیل کی ہے جسے مدیر صاحب نے ماننے سے انکار کر دیا۔ تفصیلات کے مطابق عائشہ ریاض آف میاں چنوں نے مدیر صاحب سے اپیل کی ہے کہ وہ خطوط کو توڑا پھوڑا نہ کریں۔ مگر مدیر صاحب نے ان کی اس اپیل کو سر آنکھوں پر رکھنے کی بجائے جوتے کی نوک پر رکھتے ہوئے ہوا میں اڑا دیا اور روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ان کے ہوتے ہوئے توڑ پھوڑ (کانٹ چھانٹ) نہیں رک سکتی۔ اس موقعے پر ہمارے غیر حاضر دماغ نمایندے نے مشورہ دیا ہے کہ اس توڑ پھوڑ پر قابو پانے کے لیے فوری طور پر ایک امن کمیٹی قائم کی جائے جو توڑ پھوڑ بند کروانے کے لیے مدیر صاحب سے مذاکرات کرے۔ اگر مذاکرات کے لیے کسی کنٹینر کا بندوبست بھی ہو جائے تو زیادہ سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔ امید ہے کہ یہ مذاکرات پاکستان اور انڈیا کے مذاکرات کی طرح کبھی نہ کبھی کامیاب ہو ہی جائیں گے اور توڑ پھوڑ کا مسئلہ بھی کشمیر کی طرح حل ہو جائے گا۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق خدیجہ ریاض آف میاں چنوں نے بڑھاپے کے تازہ ترین درجات جاری کر دیے ہیں۔ اس کے مطابق حافظ عبدالجبار پردادا بن کر بڑھاپے میں پہلے نمبر پر آ گئے ہیں۔ کچھ پوائنٹس کی کمی کے ساتھ حافظ حمزہ شہزاد بابا بن کر دوسرے نمبر ہیں۔ جب کہ غیر حاضر دماغ نمایندے دادا بن کر تیسرے نمبر پر آ گئے ہیں۔ اس نئی درجہ بندی کے مطابق بڑھاپے کے سابق چیمپئن اشتیاق احمد بڑھاپے کی دوڑ سے آؤٹ ہو کر جوانی کی دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس لیے بہت جلد ان سے کہا گیا ہے کہ اپنی لاٹھی نیوز چینل کے خزانے میں جمع کرا دیں۔ دوسری طرف نئے ''بڑھاپا چیمپئن'' حافظ عبدالجبار سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ چارپائی سے نیچے قدم نہ رکھیں، ورنہ ان سے یہ اعزاز چھین لیا جائے گا۔ نئے بابا جی حافظ حمزہ شہزاد سے کہا گیا ہے کہ وہ صرف اتنا خیال رکھیں کہ بچوں کا اسلام میں کون آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے۔ آخر میں ہمارے غیر حاضر دماغ نمایندے کی طرف سے اپنی ہونہار پوتی خدیجہ ریاض کو سلام اور ان کے چہیتے بھائی اشتیاق احمد کو پیار۔ اس سے پہلے کہ محمد طیب طاہر آف فیصل آباد ہمارے خلاف علمِ بغاوت بلند کریں، ہم قارئین کو بتاتے چلیں کہ یہ اشتیاق صاحب کے درآمد شدہ بھتیجے ہیں اور اشتیاق صاحب کو تایا جان سمجھتے ہیں۔ اس لیے تمام قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جو قارئین اشتیاق صاحب کو تایا جان سمجھتے ہیں، مسئلہ فیثا غورث کی رو سے خدیجہ ریاض ان کی پھوپھی بن گئی ہیں، لہٰذا اگلی عید پر تمام بھتیجے بھتیجیاں ان سے دل کھول کر عیدی کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

کھیل:۔ ہمارے کھیلوں کے نمایندے کی رپورٹ کے مطابق ''انگلش کمیٹی'' کی طرف سے عوام کے خلاف میدان میں اتاری گئی نئی ٹیم نے میچ کے ابتدائی لمحات میں ہی مہنگائی کے باؤنسرز مارنا شروع کر دیے ہیں، جس سے عوامی ٹیم دباؤ کا شکار ہو گئی ہے اور مہنگائی کے ان باؤنسرز کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ان باؤنسرز کو روکنے کا مطالبہ کرنے لگی ہے۔ دوسری طرف نئی ٹیم کے کپتان کا کہنا ہے کہ پچھلی ٹیم نے اپنی اننگز کھیلتے ہوئے قرضے اور افراطِ زر سے معاشی پچ خراب کر دی ہے جس کی وجہ سے مہنگائی کے باؤنسرز اٹھ رہے ہیں۔ کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معاشی پچ کی حالت بہتر ہو جائے گی اور عوام کے لیے یہ ٹیسٹ میچ کھیلنا آسان ہو جائے گا۔

ہمارے غیر حاضر دماغ نمایندے نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ معاشی پچ کے درست ہونے سے پہلے ہی عوامی ٹیم ادھ موئی ہو کر گر پڑے اور میچ درمیان میں روکنا پڑے۔

موسم:۔ ہمارے خیالی محکمہ موسمیات کی رپورٹ کے مطابق بجلی اور تیل کی قیمتوں میں اضافے کے بعد مہنگائی کے بادلوں کا ایک بڑا سلسلہ نظر آ رہا ہے جس سے لوٹ مار کی موسلا دھار بارش کی توقع ہے۔ اس سے عوامی جیبوں پر سیلابی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی اور خدشہ ہے کہ اس ممکنہ سیلابی صورتِ حال میں بجلی کے بڑے بل کی صورت میں کوئی سیلابی ریلا غریب عوام کی تمام جمع پونجی بہا کر لے جا سکتا ہے۔ ہم قارئین کو بتاتے چلیں کہ اس سیلابی صورتِ حال میں عوام نے بچت کے بند باندھنے سے معذرت کر لی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایسی صورتِ حال میں بچت کے بند باندھنا ان کے بس میں نہیں ہے۔

موسم کی اس خود ساختہ رپورٹ کے ساتھ ہی ہمارے نیوز چینل کا وقت ختم ہوا۔

اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ!

محبت

شاکرہ محمد علی رانا۔ شہر سلطان

طور پر ''صلی اللہ علیہ وسلم'' نہ کہتی۔ کلاس میں بیٹھی ایک بچی کو یہ حرکت نہایت ہی ناگوار گزری۔

اس لڑکی کی اس حرکت کو ایک دفعہ برداشت کرنے کے بعد اس بچی سے رہا نہ گیا۔ وہ اچانک اپنی نشست سے اٹھی اور زوردار آواز میں بے اختیار پکار اٹھی۔ ''صلی اللہ علیہ وسلم، صلی اللہ علیہ وسلم، صلی اللہ علیہ وسلم'' ہال میں سناٹا چھا گیا۔ سکول کی تاریخ میں پہلی بار کسی نے نظم و ضبط کی خلاف ورزی کی تھی۔ بچی کو فوری طور پر ہال سے نکال دیا گیا۔ یہودی و عیسائی اساتذہ اور ماہرین نفسیات پر مشتمل بورڈ نے بچی سے متعدد سوالات کیے اور اس سے اس بے ساختہ حرکت کے بارے میں پوچھا گیا۔ بچی نے ہچکیوں اور سسکیوں میں ایمان افروز جواب دیا:

''جب کوئی شخص ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی استعمال کرتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' ادا کرے۔ میں اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی سن کر ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہنا میرا ایمانی و دینی حق اور فریضہ ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی سے مجھے ڈسپلن کے نام پر نہیں روکا جا سکتا۔''

یوں روح کی تسکین کا ساماں کریں گے
ایمان کے لیے جان کو قربان کریں گے

پرانی ڈائری

''امی ابا کو مجھ ہی سے نفرت ہے... سب کے ماں باپ اپنی اولاد سے ڈھیروں پیار کرتے ہیں، مگر میں جب بھی آتا ہوں پھٹکار سن کر ہی آتا ہوں، کبھی نہیں کہا کہ جیتے رہو بیٹے۔'' گاڑی کے ہارن نے اس کے خیالات کے تار کو توڑ دیا۔ لپک کر گاڑی میں سوار ہوگیا۔ عامر بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ شروع ہی سے وہ کمائی کر رہا تھا، گھریلو حالات ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ پڑھائی مکمل نہ کر سکا تھا، اس وقت وہ ایک دفتر میں کلرک کا کام کرتا تھا۔ اس کی عمر 25 برس ہوئی تو اس کی شادی بھی ہوگئی۔ شادی کے بعد اسے یہ احساس ہونے لگا کہ اس کے ماں باپ اب اس سے پیار نہیں کرتے، روزانہ وہ کسی نہ کسی بات پر چڑ جاتا تھا، بس پھر کیا، ابا سے سننی پڑتی تھیں، آج بھی کچھ ایسے ہوا تھا۔ آفس سے دیر ہو رہی تھی تو امی بولیں: ''عامر بیٹا دفتر کھلنے میں آدھ گھنٹا رہ گیا ہے اور تم ابھی تک کمرے میں بیٹھے ہو!''

''ہوں! میرا وجود تو گھر میں بوجھ ہی لگتا ہے، کہیں دو منٹ سکون کا سانس نہ لے لوں۔'' اس نے یہ سوچا اور بولا: ''امی آپ دو منٹ کو چھوڑتی ہی نہیں ہیں۔'' ساتھ ہی ناول اٹھایا، بیگ میں ٹھونسا اور چل دیا۔

☆

''بھائی کوئی پریشانی ہے کیا؟'' ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے آدمی کی آواز سن کر عامر چونک پڑا۔

''نن... نہیں تو؟ بس ذرا وہ۔'' وہ ہکلایا۔

''کیا گھر سے لڑ کر آئے ہو؟'' وہ آدمی بے تکلفی سے بولا۔

''نہیں بھائی... وہ دراصل امی۔'' اس کے منہ سے خود بخود پھسل گیا۔

''ارے بھائی! امی ڈانٹتی ہیں۔''

''نہیں بھائی... بس وہ۔'' وہ ایک بار پھر ادھورا جملہ بول کر چپ ہوگیا۔

''تم سے پیار نہیں کرتی... ہے نا... یہی بات ہے۔'' وہ آدمی زیر لب مسکرایا جب کہ عامر نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور سر جھکا لیا۔

''ارے بھائی! ایک بادشاہ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ پورے ملک میں اس کے حسن کے چرچے تھے۔'' وہ آدمی بڑے دلچسپ انداز میں بولا، ناصر ہلکا سا اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''کئی ملکوں کے شہزادوں کے رشتے آتے تھے مگر بادشاہ انکار کر دیتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اسی کی سلطنت میں رہے۔ ایک دن بادشاہ نے وزیر سے کہا۔

''ایک نوجوان لے کر آؤ جو نہایت سمجھ دار، خوب صورت باصلاحیت اور اپنے ملک کا ہی ہو، تاکہ میری بیٹی میری آنکھوں کے سامنے رہے۔''

کچھ دیر بعد وزیر نے عرض کیا: ''بادشاہ سلامت! ایک نوجوان لایا ہوں، جو نہایت سمجھ دار ہے، اس ملک کا سب سے خوب صورت نوجوان ہے، شاید ہی ایسا حسن کسی ملک کے کسی نوجوان میں ہو۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو حاضر کروں۔'' بادشاہ نے اجازت دی تو ایک نوجوان کو لایا گیا، جس نے شاہی لباس تو پہنا ہوا تھا مگر اس نوجوان کے چہرے پر خوب صورتی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تو تھی مگر آنکھیں بالکل چھوٹی چھوٹی، چہرے کے رہے سہے رعب کو ختم کر رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کو طیش آ گیا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

وزیر ادب سے بولا: ''بادشاہ سلامت! آپ نے کہا تھا کہ کوئی ذہین اور سمجھ دار نوجوان لاؤ، یہ ذہین و فطین، بہت سمجھ دار نوجوان ہے، آپ کے لشکر کے ہر اول لشکر کا سالار ہے اور جہاں تک رہی خوب صورتی کی بات، تو یہ کالا ہے، بدشکل ہے۔ اس کے چہرے پر رعب نہیں، لیکن میں کیا کروں یہ میرا بیٹا ہے۔ میری اولاد ہے، پوری دنیا میں مجھے اس سے زیادہ خوب صورت نوجوان کبھی نہیں ملا اور نہ مل سکتا ہے۔''

عامر کو جھٹکا لگا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ مگر اس کے ذہن میں یہ بات گونجی:

''مگر میرے ماں باپ اس وزیر کی طرح عقل مند تو نہیں ہیں۔ وہ تو گھر میں میرا وجود برداشت نہیں کرتے۔''

''نرسری والے۔'' کنڈیکٹر کی آواز گونجی، وہ سیٹ سے اٹھا اور گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

☆

آج بھی وہ کھچا کھچا سا تھا۔ چائے کے وقفے میں اس نے ناول نکالا تو اچھل ہی پڑا۔

''ارے آج تو ناول کی جگہ کوئی اور چیز آ گئی... یہ کیا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔

''یہ تو ابا کی پرانی ڈائری ہے۔'' ڈائری کھولتے ہی اس کی نظر ایک صفحے پر پڑی۔

ف، ح۔ کراچی

7 دسمبر 1978ء... آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک چاند سا بیٹا دیا، میں نے اس کا نام عامر شہزاد رکھا ہے... اللہ کا شکر ہے اس کی ماں کو اللہ تعالیٰ نے نئی زندگی دی... آج میں پھوٹی کوڑی کا بھی محتاج ہوں مگر عامر کی خوشی میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا، اللہ میرے بیٹے کو میری زندگی بھی لگا دے... آمین!

10 دسمبر 1978ء... آج ٹھٹھرتی شب ہے... ہمارے پاس صرف ایک کمبل ہے، عامر کو بہت سردی لگ رہی تھی... میں نے اپنے حصے کا کمبل اتار کر عامر کو اس میں لپیٹ دیا، ہم دونوں میاں بیوی نے رات جاگ کر گزاری۔

25 دسمبر 1978ء... آج ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔ رات سردی کی وجہ سے میں اور میری بیوی سو نہیں سکے، لیکن اللہ کا شکر ہے عامر سو لیتا ہے تو ہماری پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔

13 جنوری 1979ء... عامر کو شدید بخار ہے۔ ہم نے اپنے دو دن کے پیسے بچا کر عامر کے لیے دوا کا بندوبست کیا۔ اللہ کا شکر ہے، عامر اب ٹھیک ہے، نہ جانے یہ اولاد کیا کہے گی کہ ہم نے اس سے کبھی محبت نہیں کی۔

10 مئی 1988ء۔ آج عامر نے اپنے دوستوں سے مرعوب ہو کر عید کے لیے نئے کپڑے

شاباش!

”خبردار مت ہاتھ لگانا اسے۔“ میرے بالکل پیچھے ایک عورت کی دبی دبی غصیلی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر مڑی تو دیکھا ایک عورت اپنے چھ، سات سالہ بچے کو ڈانٹ رہی تھی۔ عورت حلیے سے کافی غریب اور مفلس دکھائی دے رہی تھی۔

ہوا یوں کہ میں گاؤں گئی ہوئی تھی۔ وہاں امیمہ شدید بیمار ہوگئی۔ قریب کے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر تیسرا دن ہونے کے باوجود بخار ہلکا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آخر سب کے مشورے سے ہری پور لے گئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ بچوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر ناصر کو دکھایا جائے۔ ہم ظہر کے بعد گھر سے نکل گئے، ویسے تو ڈاکٹر صاحب شاید اپنے وقت پر ہی بیٹھتے ہیں مگر نہ جانے کیوں اس دن عصر کے بعد مغرب کا وقت بھی نکل چکا تھا مگر ڈاکٹر صاحب کا کوئی پتا نہ تھا۔ مسلسل یہی کہا جارہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب راستے میں ہیں، ابھی پہنچنے ہی والے ہیں مگر وہ ”ابھی“ نہیں آئے تھے۔ بڑا ہال خواتین اور بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مقامی لوگوں کے لیے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر ڈاکٹر ناصر کے پاس آنے والے لوگوں کی بڑی تعداد کا تعلق دور دراز کے علاقوں سے ہوتا ہے، انھیں آنے جانے میں بہت مشکلات پیش آتی تھیں جب تک کہ اپنی گاڑی نہ ہو۔ خیر جب عشاء کا وقت بھی قریب آگیا تو خواتین اور مرد ڈاکٹر ناصر کو برا بھلا کہتے اپنے بیمار بچوں کو لیے پلازہ سے نکل گئے۔ عشاء کی اذان شروع ہوئی ہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور بیگ رکھتے ہی اعلان کیا کہ عشاء کی نماز کے بعد مریضوں کو دیکھنا شروع کریں گے۔ یہ کہہ کر جناب مسجد تشریف لے گئے۔ جب ڈاکٹر صاحب نماز کے بعد تشریف لائے تو صرف چند لوگ ہی کلینک میں رہ گئے تھے۔ امیمہ مسلسل روئے جارہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر ہال میں ٹہلنے لگی۔ اسی دوران پیچھے سے ایک عورت کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو وہ عورت اپنے چھوٹے سے معصوم بیٹے کو ڈانٹ رہی تھی۔ مارے تجسس کے میں اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ دیکھا کہ سامنے بینچ کے نیچے 20 روپے کا نوٹ پڑا ہوا تھا اور اس نوٹ کو اٹھانے کے لیے بچہ جیسے ہی جھکا، ماں نے آواز دے دی۔ اپنی ماں کی آواز سنتے ہی بچہ کانپ گیا اور سہم کے اپنی ماں کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ ماں اسے سمجھانے لگی کہ بیٹا کسی بھی گری ہوئی چیز کو نہیں اٹھاتے جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ گری ہوئی چیز آپ کی اپنی ہے۔ بچہ بظاہر ماں کی بات پر سر ہلا رہا تھا مگر اس کی نظریں اس نوٹ پر جمی تھیں۔ یہ دیکھ کے ماں نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور لے کے ہال کے دوسری طرف چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی ایک لمبی چوڑی خوب صورت سی عورت ایک نو، دس سالہ بچے کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی اور آ کر اسی بینچ پر بیٹھ گئی۔ ابھی میرے ذہن میں اس غریب عورت کی آواز گونج رہی تھی کہ اس عورت نے اٹھ کے 20 روپے کا نوٹ اٹھایا اور بچہ کو دیتے ہوئے ڈانٹنے لگی:

حفصہ سیماب۔ کراچی

”ایان چل پکڑ اپنے پیسے، بے وقوف نہ ہو تو! دیکھو تو سہی اپنے بیس روپے پھینک دیے ہیں اونہہ۔“

بچے نے پہلے تو ماں کو حیران ہو کر اسے دیکھا، پھر خوشی خوشی نوٹ پکڑ لیا۔ مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں اس عورت کا جائزہ لینے لگی۔ قیمتی سوٹ، سونے کے زیورات، ہاتھ میں قیمتی موبائل، دیکھنے میں ہی وہ عورت کافی ماڈرن لگ رہی تھی مگر اس کا ایک چھوٹا سا عمل؟ میں ان دونوں عورتوں کا موازنہ کرنے لگی۔ غریب عورت کا سوٹ مسلسل پہننے کے باعث گھس چکا تھا۔ دوپٹے میں جگہ جگہ سوراخ ہو چکے تھے اور پاؤں میں ٹوٹی ہوئی جوتی تھی، میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی۔ غریب عورت جو شاید بہت کم پڑھی لکھی تھی، کس قدر تہذیب یافتہ نکلی اور امیر عورت بظاہر مہذب ہوتے ہوئے بھی غریب عورت سے کس قدر پیچھے رہ گئی۔ میں سوچنے لگی کہ جب تک اس غریب عورت جیسی مائیں اس دھرتی پر موجود ہیں، یقیناً دیانت داری باقی رہے گی۔ کاش کہ اس ملک کی ہر ماں اس غریب عورت کی طرح اپنے بچوں کی تربیت کرنے لگ جائے۔ کاش!

مانگے۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے، مگر عامر رونے لگا۔ مجھ سے اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ میں نے ابا کی اکلوتی نشانی اپنی بڑی چارپائی بیچ دی اور عامر کو کپڑے لا دیے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی دیکھ کر اس کی ماں ساری رات روتی رہی کہ آج میرا لعل خوش ہے۔

عامر صفحات پلٹتا جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے۔ اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ڈائری بند کرے۔ اس کے والد نے اس کی ایک ایک ادا کو کیسے کیسے لکھا ہوا تھا، بڑی مشکل سے اس نے ڈائری بند کی، کیونکہ چائے کا وقفہ ختم ہو چکا تھا، اسے اپنے والدین بہت عظیم نظر آنے لگے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے اور ماں، باپ کے قدموں میں سر رکھ دے۔ مگر آج اسے ایک بہت اہم فائل پوری کرنی تھی۔ اس لیے وہ شدید خواہش کے باوجود گھر نہ جاسکا۔ وہ جذباتی آدمی تھا، جذبات سے مغلوب ہو کر وہ منیجر کے پاس گیا۔

”سر... مجھے بہت ضروری کام سے گھر جانا ہے... پلیز آج مجھے چھٹی دے دیں۔“

”دیکھو... عامر یہ فائل بہت اہم ہے اسے پورا کر دو... پھر چلے جانا۔“

”سر اس کو پورا کرتے کرتے یقیناً چھٹی کا وقت ہو جائے گا۔“ اس نے منت کرلی۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ منیجر نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

وہ بوجھل قدموں سے اپنی سیٹ پر آگیا اور فائل میں مصروف ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد گھنٹی بجی، اس نے فون اٹھایا، دوسری طرف سے اس کے ابا بول رہے تھے۔

”عامر بیٹا۔“

”جی ابا! کیسے فون کیا آپ نے۔ کوئی مسئلہ۔“

”بیٹا کوئی مسئلہ نہیں ہے... جلدی سے جناح ہسپتال پہنچو... اللہ نے تمھیں چاند سا بیٹا دیا ہے۔“ دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

وہ ایک دفعہ پھر اٹھا اور منیجر کے کمرے کی طرف جانے لگا... پھر رکا... فائل بند کر کے لاک میں رکھی... اس کا چہرہ جذبات سے تمتما رہا تھا... اس نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی... وہ دروازے کو پھلانگتا ہوا باہر نکل گیا...

☆ میاں بیوی ایک ہوٹل میں گئے۔ بیرے نے آکر پوچھا۔
''کیا لیں گے؟''
عورت نے کہا: ''سبزیوں والی روٹی۔''
بیرے نے چیخ کر کہا: ''کیا!!!''
اس پر خاوند بولا: ''گاؤں کی ہیں، پیزا مانگ رہی ہیں۔''

☆ استاد: (دیہاتی بچے سے) اے بی سی سناؤ۔
بچہ: اے بی سی۔
استاد: اور سناؤ۔
بچہ: اور سب خیریت ہے۔

☆ مالک: میں تم سے صاف صاف کہہ رہا ہوں۔
نوکر: آپ کو کیسے پتا چلا کہ مجھے صاف صاف چیزیں پسند ہیں۔

☆ لڑکا: میں اپنی دادی سے بہت تنگ تھا۔ جب بھی کسی کی شادی ہوتی، وہ میرے گال کھینچ کر کہتیں۔ اب تمھاری باری ہے، لیکن آخر میں نے ان کی یہ عادت ختم کر دی۔
دوست: وہ کیسے؟
لڑکا: جب بھی کوئی فوت ہوتا، میں ان کے گال کھینچ کر کہتا، اب آپ کی باری ہے۔ (عبداللہ۔ لاہور)

☆ ڈاکٹر: (سردار سے) جی فرمایئے! آپ کو کیا تکلیف ہے۔
سردار: آواز سنائی دیتی ہے۔ آدمی نظر نہیں آتا۔
ڈاکٹر: ایسا کب ہوتا ہے۔
سردار: فون کرتے وقت۔

☆ بہو: (اخبار پڑھتے ہوئے) ایک شخص کنویں میں گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔
ساس: بے وقوف کہیں کا۔ کنویں میں گر گیا تھا تو پانی سے ہاتھ دھو لیتا۔
(عاتکہ لقمان۔ بھکر)

☆ بیوی نے خاوند سے فون پر پوچھا، آپ کہاں ہیں، اس نے بتایا:
''وہ تمھیں سنار کی دکان یاد ہے، جس میں تمھیں سونے کا سیٹ پسند آیا تھا اور اس وقت میرے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ تمھیں خرید کر دے سکتا اور میں نے کہا تھا، بیگم ایک دن تمھیں یہ سیٹ ضرور خرید کر دوں گا۔''
بیوی نے بے تحاشہ خوش ہو کر کہا:
''ہاں ہاں! مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ تو پھر؟''
خاوند نے جواب دیا:
''بس میں اس کے ساتھ والی دکان پر بال کٹوا رہا ہوں۔
(ملک محمد رضوان کھوکھر۔ لاہور)

☆ ڈاکٹر: کیا آپ ہر وقت ہکلاتے ہیں۔
مریض: جی نہیں! صرف بولتے وقت ہکلاتا ہوں۔ (حسان سعد۔ ملتان)

☆ استاد: پاکستان کا جھنڈا سب سے پہلے کہاں لہرایا گیا۔
شاگرد: جی! ہوا میں۔ (ماریہ عزیز۔ روڈ و سلطان)

☆ ڈاکٹر: اچھی صحت کے لیے ضروری ہے کہ پھلوں کے ساتھ ان کے چھلکے بھی کھائے جائیں۔ ویسے آپ کو کون سا پھل پسند ہے۔
مریض: جی! ناریل۔ (بادشاہ خان۔ خانیوال)

ذہن کا بوجھ

''ماریہ بیٹی! شام کو یہ چاول صاف کرنے ہیں اور پھر کل صبح بنانے ہیں۔''

''جی امی ٹھیک ہے۔'' ماریہ نے ادب سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

ماریہ شام کو چاول صاف کرنا بھول گئی۔ امی کے یاددلانے پر اُسے یاد آیا۔

''امی جان! ابھی کرتی ہوں۔'' اور پھر وہ چاول صاف کرنے بیٹھ گئی۔

''بیٹی! اپنے ابو کو صبح آفس جاتے ہوئے یاد دلانا کہ شام کو آتے ہوئے آٹا لیتے آئیں۔''

چاول صاف کرتی ماریہ کو امی نے ایک اور کام سپرد کیا۔

اور پھر وہی ہوا، ماریہ دوسرے روز بتانا بھول گئی اور امی نے اسے یاد دلایا۔

ماریہ نے جب ابو کو آٹا لانے کا کہا تو انھوں نے جیب سے ایک ڈائری نکال کر اس پر لکھ دیا۔

ساجدہ خاتون اپنی بیٹی کی تربیت کے لیے مختلف کام اس کے سپرد کرتی رہتی تھیں اور ماریہ اکثر بھول جاتی تھی۔ ہر مرتبہ نرمی اور پیار سے وہ اسے سمجھاتیں کہ چھوٹی چھوٹی ان ذمے داریوں کو سمجھو گی تو پھر آگے چل کر بڑی بڑی ذمے داریوں کو نبھانا اور سنبھالنا آسان ہو جائے گا۔

راشد علی۔ نواب شاہی

ناصر صاحب بھی اس معاملے میں فکر مند تھے۔

اتوار کے روز انھوں نے ماریہ کو بلایا:

''بیٹی! کیا وجہ ہے آپ کے ذمے جو کام لگایا جاتا ہے، آپ اسے انجام نہیں دے پاتیں۔'' ابو کے یہ پوچھنے پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ آخر اس نے کہا۔

''ابو! بھول جاتی ہوں۔''

''اس بھول کا علاج سوچا؟'' انھوں نے پوچھا۔

اور انھوں نے جیبی ڈائری اس کے سامنے رکھ دی جس میں آج کے کرنے کے کام لکھے تھے۔

''بیٹی! یہ ہے اس کا علاج۔''

''مگر کیسے؟'' وہ حیران ہو کر بولی۔

''علاج سے پہلے تمھیں ایک بات بتاتا چلوں۔ آج سے بیس سال پہلے ایک مرتبہ کلاس میں استاد محترم پڑھا رہے تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے انھوں نے ایک طالب علم سے کاغذ لیا اور پھر اس پر کچھ لکھ کر جیب میں ڈال لیا، پھر فرمایا کہ ذہن کا بوجھ کاغذ پر اتار دیا ہے۔ مجھے اس وقت کوئی چیز یاد آ رہی تھی، بعد میں وہ بھول جاتا اور نہ بھولتا تو ذہن میں ایک کش مکش سی رہتی۔ بس اسی دن کے بعد سے آج تک میں بھی ڈائری لکھتا ہوں۔ آپ نے آٹے کا کہا تو ڈائری میں لکھ لیا اور شام کو جاتے ہوئے ڈائری دیکھی، یاد آ گیا کہ جاتے ہوئے گھر آٹا لے کر جانا ہے۔ بس یہ ہے اس کا علاج، آپ اپنے کمرے میں ایک کاغذ چسپاں کر دیں اور جو جو کام ذمے لگائے جائیں، وہ لکھ لیں۔ وقتاً فوقتاً آپ کی نظر اس پر پڑتی رہے گی تو یاد آتا رہے گا۔ نہ بھولیں گی اور کام بھی آسانی سے ہو جائیں گے۔ آسان علاج بتایا نا میں نے آپ کو؟''

''جی ابو! ذہن پر بوجھ نہیں رہتا اس طرح۔''

یہ سن کر ابو مسکرانے لگے۔

آمنے سامنے

☆ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ: محترمہ ساجدہ بتول کے والدِ محترم کی وفات کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ کافی دنوں کی غیر حاضری کے بعد نئے نیوز چینل کے ساتھ حاضر ہوں۔ (محمد شاہد فاروق۔ پھلور)

ج: نئے نیوز چینل کا شکریہ!

☆ بچوں کا اسلام اب ایک سایہ دار درخت بن چکا ہے۔ اللہ رب العزت مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ واقعات صحابہ کے پڑھ کر ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ (حافظ محمد طلحہ۔ جھنگ صدر)

ج: مجھے بھی حرارت محسوس ہو رہی ہے۔

☆ آپ سے مختصراً گزارش ہے کہ بچوں کا اسلام کے ابتدائی بیس شمارے جو اخباری سائز پر شائع ہوئے تھے۔ انھیں کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو بہت بہتر ہوگا اور میرا خیال ہے کہ یہ صرف میری ہی نہیں، بلکہ تمام باذوق قارئین کے دل کی آواز ہوگی۔ لہٰذا انتظامیہ سے مشورہ کر کے جلد از جلد قارئین کو خوش خبری سنائیں۔ (گوہر علی۔ نور پور نورنگا)

ج: تجویز انتظامیہ کو دوں گا ان شاء اللہ!

☆ اس سے پہلے بھی کئی خط لکھ چکی ہوں، لیکن کسی خط کی جھلک بچوں کا اسلام میں نظر نہیں آئی۔ اللہ جانے آپ تک پہنچے یا نہیں۔ ایک بار پھر خط لکھ رہی ہوں۔ شمارہ 482 پڑھ کر یہ خط لکھ رہی ہوں۔ سالنامے کا انتظار ہے۔ اب صرف ایک شمارہ اور آئے گا۔ شمارہ 482 میں مولانا محمد ہاشم عارف صاحب کا سفرنامہ اونچا پہاڑ گہرا سمندر بہت زبردست ہے، لیکن ابھی اس کا ایک حصہ باقی ہے۔ لہٰذا پورا پڑھ کر اس پر لکھیں گے۔
(ماریہ انور۔ گوجرانوالہ)

ج: دوسرا حصہ پڑھ کر تو آپ کو اور لطف آیا ہوگا۔

☆ شمارہ 582 میں آپ کی دو باتیں پڑھیں۔ اس میں مولانا ہاشم عارف صاحب کا آپ نے تعارف کرایا۔ یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ اگر آپ یہ دو باتیں مولانا محمد ہاشم عارف صاحب کے نام نہ کرتے تو مجھے اس سفرنامے کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو پاتا۔ محمد شاہد فاروق صاحب اپنے غیر حاضر نمایندے کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ غیر حاضر دماغ نمایندہ کبھی کسی کے پیچھے پڑا ہوتا ہے کبھی کسی کے۔ مدیر بے چارے تو بس ان کی زد میں ہوتے ہیں۔ میرا تو جی چاہتا ہے، غیر حاضر دماغ نمایندے پر مقدمہ کر دوں۔ بچوں کا اسلام کی عدالت میں اور اپنا وکیل کروں سرور مجذوب کو، لیکن ڈر ہے۔ غیر حاضر دماغ نمایندے سے مقدمہ لڑ کر کہیں وہ خود غیر حاضر دماغ نہ بن جائیں۔ (محمد امیر حمزہ۔ گوجرانوالہ)

جواہرات سے قیمتی

- علم وہ بہتر ہے جس پر عمل کیا جائے۔
- قلم وہ بہتر ہے جس سے جہاد کیا جائے۔
- زندگی وہ بہتر ہے جس کا کوئی مقصد ہو۔
- محبت وہ بہتر ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔
- اپنی پریشانی دور کرنی ہے تو دوسروں کی پریشانی میں شامل ہو جاؤ۔
- جو وقت گزر گیا، اس کے افسوس میں مزید وقت ضائع نہ کرو۔
- معاملات میں خوش اخلاقی سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں۔
- جو بچپن میں ادب نہ سیکھ سکا، بڑے ہو کر بھی اس میں بھلائی نہیں ہوگی۔
- انسان کا سب سے بڑا بوجھ اس کا غصہ ہے۔
- ناکامی کے دامن میں کامیابیوں کے پھول بھی ہوتے ہیں۔
- جو بات معلوم نہ ہو، اس کے پوچھنے میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔

ارسال کرنے والے: یاسر خان سواتی۔ عفت بتول جھاوریاں۔

ج: خیال تو زبردست ہے آپ کا۔

☆ شمارہ 582 پر ایک سرسری نظر ڈالی تو ایک نام پر نظر جم گئی۔ ارے مولانا محمد ہاشم عارف ڈائریکٹر M.I.S کی تحریر۔ دل بلیوں اچھلنے لگا کہ بڑی قیمتی روداد ہوگی۔ پھر شمارے کی دو باتیں پڑھ کر مضمون کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ پہلی قسط بہت جامع انداز میں تھی۔ معلومات سے پُر اور تجسس سے بھرپور۔ دل بے چین ہے اگلی قسط پڑھنے کے لیے۔ مہربان کیسا دل کو بہت بھائی۔ ف ح کراچی کی جیت کا داغ نہایت سبق آموز تھی۔ روزمرہ کا وظیفہ تو بہت ہی پسند آیا۔ سارہ خالد کی کہانی خوب تھی۔ نیوز چینل تو اب پوری آب و تاب سے آتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اس کی زد میں آتا ہی رہتا ہے۔ اس بار اس کی زد میں سرور مجذوب، اشتیاق احمد، لیاقت علی اور آصف مجید ہیں۔
(بنتِ سیف الرحمٰن۔ گوجرانوالہ)

ج: کوئی فکر کی بات نہیں۔

☆ شمارہ 582 سامنے ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوب ہے۔ خاص طور پر گہرا سمندر، اونچا پہاڑ۔ مولانا محمد ہاشم عارف صاحب نے سفرنامہ لکھ کر قارئین پر احسان کیا ہے۔ مفتی جمیل الرحمٰن عباسی بچوں کا اسلام میں لکھنے میں کنجوسی کیوں کرتے ہیں۔ ویسے وہ لکھنے کے بادشاہ ہیں۔ مولانا ہاشم صاحب کوہِ طور کا جو پتھر لائے ہیں، اس کی تصویر بھی بچوں کا اسلام میں شائع کریں، تاکہ ہم بھی اسے دیکھ سکیں۔ (محمد ابراہیم قاسمی۔ ملتان)

ج: آپ کا خط پڑھا۔ بچوں کا اسلام میں آپ حضرات کے خطوط اور دوسری چیزیں شائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دو باتیں میں کوئی موقع ملا تو ضرور ذکر کروں گا۔

☆ عید والے دن فون پر آپ سے بات ہوئی۔ آپ نے خوش گوار موڈ میں بات کی۔ اس لیے بہت خوشی ہوئی۔ شمارے میں ف ح کراچی کا اضافہ بہت خوش آیند ہے۔ بچوں کا اسلام نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اس بات کی بہت خوشی ہے۔
(الف۔ ح۔ وار برٹن)

ج: خط مختصر لکھیں۔ وقت کا احساس کریں۔

☆ بچوں کا اسلام کا معیار روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے اور فرحت کلثوم انصاری ہماری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، ان کی سبھی کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ (عمارہ عائشہ۔ گوجرانوالہ)

ج: یہ قارئین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

☆ 581 میں بینا رانی کی کہانی زہر کا ٹیکہ پڑھ کر دل غمگین ہو گیا۔ والدین اولاد کی خاطر کیا کیا کرتے ہیں اور اولاد بسا اوقات بے وفا نکلتی ہے کہ بوڑھے ماں باپ دس بچوں پر بھی بوجھ ہوتے ہیں۔ محمد زبیر قلندری نے اپنی کہانی میں بعض سخت قسم کے ڈاکٹروں کا نقشہ کھینچا۔ جاسوسی ناول، خاموش ہتھیار بہت مزے کا ہے۔ 581 میں دوڑ پیچھے کی طرف خدیجہ ارشاد کی کہانی پڑھ کر کراچی کے لیے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
(خنسا محمود۔ گوجرانوالہ)

ج: بہت کوشش کی جاتی ہے کہ قارئین کو غم زدہ کرنے والی کہانیاں نہ لگائی جائیں، لیکن پھر بھی!

☆ اس وقت عید کی وجہ سے شمارہ 581 حاصل کرنے کے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑے، آخرکار منگل کے روز شمارہ ملا۔ دو باتیں میں آپ سے ملاقات ہو گئی۔ حافظ عبدالجبار کی کہانی پانی میں دودھ سبق آموز تھی۔ مولانا اللہ وسایا صاحب کا سلسلہ ختم نبوت زندہ باد بہت مختصر لیکن سب سے اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی میں برکت عطا فرمائے۔ اس مرتبہ واقعات صحابہ کے پڑھتے ہوئے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خاموش ہتھیار سسپنس سے بھرپور تھی۔ دوڑ پیچھے کی طرف ایک فکر انگیز تحریر تھی۔ اسی طرح ایک لائن بوڑھوں کی معاشرے میں ظلم کو ظاہر کر رہی تھی۔ باقی سب کہانیاں بھی خوب تھیں۔
(نذیر احمد شاہ۔ گاؤں میاں عیسیٰ)

ج: بھرپور تبصرے کے لیے شکر گزار ہوں۔

بھکاری نامہ

آپ یقین کیجیے اس دنیا میں سب سے زیادہ خطرناک چیز نہ تو گولی ہے اور نہ ہی گالی، بلکہ سب سے خطرناک، ہیبت ناک، دہشت ناک اور خوف ناک جو چیز ہے، وہ ہے بھکاری! ہوسکتا ہے، آپ کہہ اٹھیں کہ جی یہ کیا بات ہوئی۔ بھکاری اور خطرناک! بھکاری کو تو لوگ پوچھتے تک نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ انھیں دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے، گویا وہ کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ پھر اوپر سے آپ کا کہنا ہے کہ سب سے خطرناک، حتیٰ کہ گولی سے بھی خطرناک بھکاری ہیں۔

وقاص یوسف بھڑنگ۔ کراچی

میں کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا۔ گولی سے تو انسان کو چند لمحے تکلیف ہوتی ہے، پھر بندہ اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح گالی کو لے لیجیے۔ گالی بھی بہت خطرناک چیز ہے، لیکن اس سے اگلے انسان کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، بلکہ گالی دینے والا خود نقصان اٹھاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اور لوگوں کی نگاہ سے گر جاتا ہے۔ اپنی کم عقلی کا ثبوت دیتا ہے جب کہ بھکاری خود بھی پریشان ہوتا ہے۔ دوسروں کو بھی پریشان کرتا ہے، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ خود تو مزے میں ہوتا ہے، اوروں کو پریشان کرتا ہے۔

آج کل کے بھکاری بھی کچھ زیادہ ہی عجیب ہوگئے ہیں۔ غریب تو بے چارے پہلے ہی تھے۔ ویسے ایک بات ہے، بھکاریوں کو غریب کا لقب مفت میں مل گیا ہے۔ چند ماہ قبل اخبار میں پڑھا تھا کہ کسی ملک کی ایک خاتون نے بھیک جمع کر کے ملک کے صدر سے زیادہ دولت جمع کرلی ہے۔ خیر! ایک زمانہ تھا کہ بھکاری خال خال ہی نظر آتے تھے، بلکہ مسلم دنیا میں تو بھیک مانگنا اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی نہایت برا عمل سمجھا جاتا تھا، لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب آپ کو ہر ملک، ہر شہر، ہر گاؤں، ہر چوراہے، ہر گلی اور ہر محلے میں اداکاریاں کرتے ہوئے بھکاری دکھائی دیں گے۔ آپ اگر اداکاروں سے ملنے کے شوقین ہیں اور کسی وجہ سے ان سے مل نہیں پا رہے تو آپ ان بھکاریوں سے ملاقات کرلیجیے۔ آپ کا شوق پورا ہوجائے گا۔ علاقے اور جگہ کے اعتبار سے بھکاریوں کے انداز جدا جدا ہیں۔ اگر کسی خوشحال علاقے کا بھکاری ہے تو وہ آپ کو تندرست اور صحت مند دکھائی دے گا۔ ماڈرن پینٹ شرٹ اس نے زیب تن کیا ہوگا۔ جیب میں موبائل بھی موجود ہوگا۔ اسی قسم کا ایک بھکاری ایک دن ہمیں نصیب ہوگیا۔ ہم نے حیران ہو کے سوچا کہ دیکھتے ہیں، یہ کیا سوال کرتا ہے، اُس نے جو سوال کیا، وہ ہمارے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

''بھائی جان! مجھے امریکہ پڑھائی کے سلسلے میں جانا ہے۔ 9 لاکھ روپے کی فوری ضرورت ہے۔ آپ اللہ جل جلالہ کے نام پہ پچاس ہزار فراہم کردیں۔ اللہ جل جلالہ بہت دے گا!''

اگر غریب آبادی کا بھکاری ہے تو وہ آپ کو لنگڑا دکھائی دے گا۔ زمانے کو چونا لگانے کے لیے اس نے پھٹا پرانا میلا کچیلا لباس پہنا ہوگا، بھکاریوں میں بھی سب سے زیادہ خطرناک بھکاری کراچی کا بھکاری ہے، ربِ ذوالجلال کسی کو کراچی کا بھکاری نصیب نہ کرے۔ کراچی کا بھکاری اتنا باہمت ہے کہ مساجد کے اندر بھی لوگوں کے آگے با آسانی ہاتھ پھیلا سکتا ہے۔ اب تو ان بھکاریوں کی پہنچ بسوں تک ہوگئی ہے۔ بسوں میں سوار بھکاری بہت ظالم اور سفاک ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک بھکاری ایک دن ہمارے دوست اسامہ احمد کو نصیب ہوگیا۔ نتیجتاً اسامہ احمد کو اپنے نئے موبائل کی قربانی دینی پڑی۔ ہم نے جب یہ سنا تو اسامہ احمد سے پوچھ ہی بیٹھے: ''یار تم اتنے مہربان اور فراخ دل کب سے ہوگئے کہ بھکاریوں کو موبائل بخشنے لگے؟

''بھائی میرے! جان تو سب کو عزیز ہوتی ہے۔'' اسامہ نے کہا تو ہم تمام قصہ سمجھ گئے۔

بات کراچی کے بھکاریوں کی ہو رہی ہے۔ یہ آپ کی جان اُس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک آپ انھیں اللہ جل جلالہ کے نام پر کچھ دے نہ دیں۔ ہوسکتا ہے آپ یہ سمجھ رہے ہوں کہ کراچی بھکاریوں کا شہر ہے۔ جی نہیں اب ایسی بات بھی نہیں، چونکہ کراچی میٹروپولیٹن سٹی ہے۔ لوگ پورے ملک سے کاروبار کے سلسلے میں یہاں آتے ہیں۔ یہ بھکاری بھی اسی سلسلے میں یہاں تشریف لاتے ہیں۔ خصوصاً رمضان المبارک کے مہینے میں بھکاریوں کے بہت سے خاندان کراچی ہجرت کرتے ہیں۔ یوں سیزن سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں اور کراچی کی رونقوں میں مزید اضافہ بھی کرتے ہیں۔

بھکاریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا بنیادی سبب خواتین ہیں۔ بہت سی خواتین ان بھکاریوں کو اللہ والے سمجھتی ہیں کہ ان کی دعائیں فوراً قبول ہوجاتی ہیں، لہٰذا وہ ان بھکاریوں کو کچھ نہ کچھ نوازتی رہتی ہیں۔ ایک دن ایک بھکاری کو دیکھا۔ بھکاری کیا تھا، نشے میں دھت تھا۔ اس نے جھومتے جھومتے ایک دروازے پر دستک دی۔ دس روپے کا ایک نوٹ کسی خاتون نے اسے تھمایا اور کہنے لگیں: ''بابا جی دعا کرنا۔'' ہمارے دل میں فوراً خیال آیا کہ یہ جو جھومتے جھومتے دعا کرے گا، کہیں واقعی قبول نہ ہوجائے۔

ایک صاحب بتا رہے تھے کہ میں بھارت گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ کوئی بھکاری نہیں ہے جب کہ غربت کا یہ عالم ہے کہ لوگ فٹ پاتھوں پر چارپائیاں ڈال کر برسوں سے رہ رہے ہیں۔ میں کافی حیران ہوا اور ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ لوگ بھیک کیوں نہیں مانگتے۔ وہ پہلے بہت ہنسے، پھر کہنے لگے: ''سب کو معلوم ہے کہ ہندو بنیا بہت کنجوس ہے۔ دے گا کچھ نہیں۔''

بھکاری کہیں کا بھی ہو، وہ بھکاری ہی ہے۔ مکار، عیار اور دھوکے باز۔ اگر خدا نخواستہ آپ کو کسی دن کوئی بھکاری نصیب ہوجائے تو اس کی چکنی چپڑی باتوں میں ہرگز مت آجایئے گا۔ ان بھکاریوں کو نوازنے سے بہتر ہے کہ اُن حقیقی ضرورت مندوں اور مستحق افراد کو ڈھونڈا جائے اور اُن افراد کی مدد کی جائے۔ جو غیرت مند ہوتے ہیں اور باوجود غربت کے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ بے شک یہی لوگ مستحق ہیں۔ ہمارے دین میں تو بھیک مانگنا اور سوال کرنا دونوں منع ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین اگر کبھی اونٹ پر سوار ہوتے اور ان کی کوئی چیز نیچے گر جاتی تو خود اونٹ سے اُتر کر وہ چیز اٹھاتے۔ ان کے نزدیک خادم سے وہ چیز اٹھوانا بھی سوال کرنا تھا۔

ہمارے ایک بہت ہی محترم دوست ہیں، تلمبہ میں رہتے ہیں۔ ایک موقعے پر انھوں نے کہا تھا کہ بھکاریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر تو لگتا ہے جلد ہی ہمارے ملک پر ان بھکاریوں کی حکومت ہوگی۔ اللہ ایسا وقت نہ لائے۔ آمین!